

معرفت کے موتی

حصہ دوم

پس منظر

امام عالی مقام کے روحانی اور عرفانی معجزات

علامہ نصیر الدین نصیر ہونزائی

معرفت کے موتی

حصہ دوم

(پس منظر)

امام عالی مقام کے روحانی اور عرفانی معجزات

بقلم علامہ نصیر الدین نصیر ہونزائی

ریسرچ ایسوسی ایٹ یونیورسٹی آف مونٹریال کینیڈا

شائع کردہ:-
خانہ حکمت ادارہ عارف

۱- بی، نور ویلا
۲۴۹- گارڈن ویسٹ
کراچی- ۳ (پاکستان)

حرفِ آغاز

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ - اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَ
آلِ مُحَمَّدٍ -

بندۂ عاجز و ناتوان، خاکپائے مومنان، صدقہٴ رُوحِ دوستان،
یعنی نصیحتیں حقیروںِ عرض پر داز ہے کہ کاش اس حصولِ نعمت اور
شکرگزاری کے موقع پر یہ ناپسین غلام طوفانی گریہ و زاری کے عالم میں بحضورِ
خداوندِ قدوس ہمہ وقت سر بسجود ہو سکتا، جبکہ وہ مُنعم و مُحسن و ایما
احسان ہی احسان فرما رہا ہے، اور خاص کر آج کی نعمت بڑی عجیب و
غریب اور عظیم ہے، یہ رُوحانی نعمت اس کتاب کی شکل میں ہے، جو آپ
کے سامنے ہے، جس کا نام ”معرفت کے موتی“ حصّہ دوم ہے، صرف
یہی نہیں، بلکہ اس کا انگریزی ترجمہ بھی بنام ”پرنس آف معرفت“ پارٹ
سیکنڈ، میرے رُوحانی دوستوں نے بڑی عمدگی سے تیار کیا ہے، اُن کے
لئے میری رُوح بطریقِ حکمتِ خدا اور قربان ہو!

امامِ اقدس و اکرم صلوات اللہ علیہ کے حبشِ سیمین کا سال سراسر

رہتوں اور برکتوں سے مملو تھا، اس میں جماعتی اور انفرادی پیش رفت و ترقی لازمی تھی، اس لئے ہر جماعتی ادارے نے اس ہم گیر وہم رس پر دو گرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اور ہر فرد نے دل کھول کر خدمت کی، اور نتیجے کے طور پر سب کے سب دینی دولت سے مالا مال ہو گئے، اگر یہ خاکسار یہاں اپنی بات بھی کرے تو شاید بیجا نہ ہوگا، چنانچہ مومنین کی دعا اور تائید ایزدی کی دستگیری سے اس بندۂ کھترتین کو کراچی، ہونزہ اور لندن میں امام زمان مآدی برحق صلوات اللہ علیہ وسلم کا حکمت آگین دیدار حاصل ہوا، جس کے نتیجے میں دورۂ لندن کے چالیس دنوں میں نورانیت نے آسمان بارندہ (۱۱/۱۱) کی مرتبت میں علم و حکمت کی ایک زبردست بارش برسادی، جس کی شدت سے بعض دفعہ اس غریب اور چند خاص احباب پر کپکپی کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی، امام زمان کا یہ عقلی اور علمی معجزہ ہمارے عالی قدر دوستوں نے بھی دیکھا اور ہم سب نے شکر گزاری کے آنسو بہائے، الحمد للہ رب العالمین۔

یہاں ایک بڑا اہم سوال ہے کہ اس مادی ترقی کے طوفان خیز دور میں جبکہ حقیقت اہل جہاں ظاہری رنگینیوں سے خیرہ ہو رہی ہے، ہم کس درجہ یا کس نوعیت کے علم کے سہارے اپنے مقدس عقیدے کو محفوظ و سلامت رکھ سکتے ہیں؟ آیا نورِ خداوندی کے خزانوں میں کوئی ایسا علم نہیں ہے، جو انطلابی طاقت کا حامل ہو، جس کی پُرکشش نورانیت میں ہم دین اسلام کی روح و روحانیت کو بخوبی سمجھ سکیں، اور عقیدے کی

حفاظت کریں؟ اس کا جواب نفی میں نہیں بلکہ اثبات میں ہے۔

حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ نے ایک ارشاد میں ذوالفقار کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ امام عالی مقام ایک دور کے بعد آہنی ذوالفقار کی بجائے علمی ذوالفقار کے استعمال کو پسند فرماتے ہیں، اور یہ سچ ہے کہ اس زمانے میں نورِ امامت نے بطورِ خاص ایک علمی قیامت برپا کر دی ہے، جو ظاہراً و باطناً اثر انداز ہو رہی ہے، جس کی ایک مثال وہ تصورِ آفرینش ہے، جو حضرت امام عالی مقام نے پیش کیا ہے، دوسری مثال حقیقتِ واحدہ (MONOREALISM) ہے، اس نوعیت کے تصورات میں علمی قیامت کا انقلابی اثر پتہاں ہے اور ان تمام چیزوں کا تعلق روحانی قیامت سے ہے۔

ہاں یہ درست ہے کہ ہر انسانی رُوح لا تعداد ذرات پر مبنی ہے، کیونکہ ساری حکمت، اسی میں ہے کہ رُوح اپنے اجزاء کا مجموعہ ہو تاکہ یہ نفسِ کلی کی مثال قرار پائے، ساتھ ہی ساتھ اس کی کثرت سے عالمِ صغیر کی تکمیل ہو جائے، اور ان تمام ذرات کی باہمی وحدت نہ صرف انسان کی "انا" کہلاتے، بلکہ توحیدِ باری تعالیٰ یا ایک حقیقت کی مثال بھی بن سکے، چنانچہ میری رُوح کا ہر ذرہ کسی خارجی وجود کا نمائندہ ہے، سو کائنات میں کوئی ایسی چیز نہیں، جس کی نمائندگی ان ذراتِ رُوح میں نہ ہو، تاہم قانونِ اختصاص کے بموجب میری

رُوحانی ہستی میں وہی ذرات زیادہ سے زیادہ مثبت کام کرتے ہیں، جو میرے عزیزوں سے مربوط ہیں۔

خانہٴ حکمت اور ادارۃ عارف سے منسلک حضرات مجھے بجد عزیز ہیں، کیوں نہ ہوں جبکہ وہ سرچشمہ (حقیقی) محبت یعنی امام زمانؑ اور پیاری جماعت کی ایک ایسی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، کہ اگر وہ صحیح معنوں میں عمل میں آئی تو وہ ہمہ رُس بھی ہے اور ہمہ گیر بھی، وہ حال کے لئے بھی ضروری ہے اور استقبال کے لئے بھی، اور یہ تمام خدمات میں سے بہترین خدمت علمی صورت میں ہے۔

انسان کی دینی اور دنیوی زندگی سے تعلق رکھنے والی تمام چیزیں سب کی سب اپنی اپنی جگہ ضروری ہیں، ان میں کوئی شے غیر ضروری نہیں، لیکن دینی علم سب سے بڑھ کر ضروری ہے، کیونکہ دُنیا و مافیہا دین کی خاطر بنائی گئی ہے، اور دین کا مقصد علم کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا ہے، اس سے یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ اگرچہ دین میں طرح طرح کی خدمات ضروری ہیں تاہم علمی خدمت بدرجہا انتہا ضروری ہے۔

دل چاہتا ہے کہ میں اس کتاب کی خوب تعریف و توصیف بیان کروں، لیکن اس میں ایک بات کا خوف دامنگیر ہوتا ہے، وہ یہ کہ کہیں کوئی یہ گمان نہ کرے کہ یہ بندہ اسی صورت میں خود ستائی کرنا چاہتا ہے، مگر عقل والے جانتے ہیں کہ کوئی بھی حقیقی درویش اصولاً اپنی تعریف نہیں کر سکتا، کیونکہ اس کی کوئی منطق نہیں بنتی ہے کہ کوئی سائل درویش

بادشاہِ غنی کے درِ دولت پر "تشیائے لئد" کی صدا لگاتے ہوئے خود کو امیرِ ظاہر کرے،
یا لوگوں کے پاس صاحبِ دولت ہونے کا دعویٰ کرے، لوگ کیسے باور
کر سکتے ہیں کہ ہر وقت درِ یوزہ کرنے والا بھکاری بحقیقت امیر ہے، سو اہل
مثال سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ اس کتاب میں جو معجزاتی درجے
کا علم و حکمت ہے وہ درحقیقت آلِ محمدؑ و اولادِ علیؑ یعنی امامِ زمان کے
زندہ معجزات میں سے ہے۔

کتاب ہذا کے اس تعارف میں اگر لندن کے اصحابِ اہلِ
کا ذکر جمیل نہ کیا جاتے تو یقیناً بڑی ناشکری ہوگی، جبکہ وہی حضرات
اس کتاب کی تصنیف کے اصل سبب اور قوی محرک ہیں، انہی ارضی
فرشتوں نے میری تھکی ہوئی ذہنی صلاحیتوں کو پھر سے تازہ اور آمادہ کر دیا،
اور میری ہستی کے اندر اور باہر علم کی تشکیل کی خاطر شب و روز کام کیا، وہ
ان کی یادِ الہی انتہائی شیرین ہے، وہ ان کی بیحد میٹھی مناجاتِ لغاتِ آدمی
کی مثال ہے، وہ ان کی پُر سوز دُعا عبادت کا مغز ہے، وہ ان کے عاشقان
آنسوؤں کے موتی اُمول ہیں وہ ان کا عشقِ مولا شرابِ جنت کی طرح مسرت بخیز
ہے، وہ ان کا دریا تے بیخودی میں ڈوب جانا بڑا عجیب و غریب ہے،
وہ ان کی علم دوستی بڑی دلکش ہے، وہ ان کی عاجزی سب کے لئے
قابلِ تقلید ہے، وہ ان کی سخت محنت و جانفشانی کا مہابی کا زربین اصول
ہے، وہ ان کی وفاداری برائے امامِ سرِ مایۃ ایمان ہے، وہ ان کی
عملی اخوت و یگانگت نمونہ یک حقیقت (مونوریا لزم) ہے، وہ ان کا

جذبہ خدمت اور اور اس کا عمل بڑا سبق آموز ہے، اور وہ ان کی قلبی خدمت یقیناً ہمہ راس ہے۔ یہ ساری چیزیں ایک ایک ہو کر میرے دل و دماغ کو چھوتی رہتی ہیں، اور میرے چہرہ خیال کو ان عزیزوں کی طرف متوجہ کر دیتی ہیں۔

بالآخر یہ خادم جناب فتح علی حبیب صدرِ خانہ حکمت مرکزہ کراچی اور جناب محمد عبدالعزیز صدرِ ادارہ عارف مرکزہ کراچی کا شکریہ گزارا وہ ممنون ہے، نیز دونوں پریذیڈنٹ کے نائب صدر صاحبان، سیکرٹری صاحبان، دیگر عملداران اور ارکان کا بھی شکریہ ادا کرتا ہے کہ لندن کا ہو یا کسی اور مقام کا، کوئی بھی کامیاب دورہ ان کے مشورہ اور پشت پناہی کے بغیر ممکن نہیں، اسی خلوص و جذبے سے میں مشرق و مغرب کی اپنی تمام شانوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ وہ اعتماد و یقین کے ساتھ اس علمی خدمت کے منصوبے میں شریک ہیں، اور کئی طرح کی قربانیاں دے رہے ہیں، بحکم حدیث شریف: "الَّذِينَ يُصِدِّقُونَ دِينَكَ مِثْقَلِ ذَرَّةٍ مِنْهُ سَجِدُوا لَكَ وَهُمْ مِنْ رِبِّكَ مُشْتَرِكُونَ"۔ ہر مومن کے دل میں نیک نیتی، خیر خواہی اور اخلاص ہونا چاہیے اور اسی کے مطابق عملی حرکت بھی ضروری ہے، مگر اس کی کامیابی اور اجر و صلہ خداوند تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے، لہذا انتہائی عاجزی سے دعا ہے کہ پروردگار! ہم سب کو ایسی اعلیٰ توفیق عنایت فرما کہ اس کی بدولت ہم عالم اسلام اور جماعت کی کچھ علمی خدمت کر سکیں، خداوند اہم اس کے

قابل نہیں ہیں، اس لئے توہی اپنی عنایتِ بے نہایت سے ہمیں مدد دے!
 ریحی محمدؑ و آلِ محمدؑ۔

سوموار ۱۵ اگست ۱۹۸۳ء
 ۴ ذی القعدہ ۱۴۰۳ھ
 سالِ شوک ۱۹۸۳ء

نصیر الدین نصیر ہونزائی

کراچی

Institute for
 Spiritual Wisdom
 and
 Luminous Science

Knowledge for a united humanity

صورتِ رحمان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ حضرت انسان جہاں انسانِ کامل کی مرتبت میں بحقیقت بنی آدم کہلاتا ہے، اور جہاں وہ اُن پر حکمت فرمائی اشارات کا مصداق ہے جو اولادِ آدم کی کرامت و فضیلت کے بارے میں فرمائے گئے ہیں وہاں وہ ظاہراً و باطناً رحمانی صورت رکھتا ہے، کیونکہ خدائے رحمان نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی رحمانی صورت پر پیدا کیا تھا، اور اگر یہ بنیادی حقیقت نہ ہوتی، تو بموجب قانونِ فطرت وجودِ آدم کے ساتھ رُوحِ خُداوندی کا کوئی رشتہ نہ بنتا، جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا ہے:

فَاِذَا اسْوٰیْتَهُ، وَنَفَخْتَ فِیْهِ مِنْ رُوْحِ فَقَعُوْا لَہٗ

سُلٰجِدِیْنَ (۱۵/۲۹) تو جس وقت میں اس کو ہر طرح سے درست کر چکوں اور اس میں اپنی رُوح (نور) پھونک دوں تو تم سب کے سب اس کے سامنے سجدہ میں گر کر پڑنا۔ اس سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے، کہ حضرت آدمؑ کی صورت ایک وجہ سے رحمان کی صورت ہے، اگر یہ دوسری وجہ سے خُدا ہر چیز سے پاک و برتر ہے۔

ارشادِ نبوی ہے کہ: خلق اللہ آدم علی صورۃ الرّحمن
اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی رحمانی صورت پر پیدا کیا۔ صورت کے معنی
یہاں بظاہر چہرہ جسم و جان ہیں اور باطن اس کا مطلب وسیلہ
معرفت ہے، جس میں سب کچھ ہے، اور ابن آدمؑ میں یہ مقدس
فطری میراث یا خصوصیت، اس طرح ہے کہ بشری شکل و صورت کے
حسن و جمال کا آغاز ارتقاء جسم سے ہو کر روح کی درجہ کمال تک
پہنچ جاتا ہے، چنانچہ قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے: هو الذی
یصوّرکم فی الارحام کیف یشاء (۴) وہی تو وہ (خدا)
ہے جو ارحام (بچہ دانیوں) میں تمہاری صورت جیسی چاہتا ہے
بناتا ہے۔ یعنی انسانی شکل و صورت کی تخلیق و تکمیل کا سلسلہ ماں کے
پیٹ سے شروع ہو جاتا ہے، پھر نوحانی ہی میں ہر آدمی کی ایک
پُر حکمت زندہ (روحانی) تصویر بنالی جاتی ہے، اگر شخص حقیقی معنوں میں
فرمانبردار ہے تو اس کی یہ باطنی صورت بحکم: صدقۃ اللہ (۳۸) بشری
تجمل سے گزر کر خدائی حسن و جمال کے مقدس رنگ میں رنگین ہو جاتی ہے
اور یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے انسانی خوبصورتی کے عکس روحانی
ہونے کا اور اس میں اضافہ و ترقی ہونے کا تصور پیش کیا ہے، او
وہ فرمان الہی یہ ہے: وَصَوَّرْکُمْ = اور خدا نے تمہاری صورتیں
بنائیں، اس میں جسمانی صورت کا ذکر ہے جو ماں کے پیٹ سے شروع
ہو جاتی ہے، فَأَحْسَنَ صُوْرَکُمْ = پھر اُس نے تمہاری صورت کو

بہترین بنا دیا، یعنی اسے مقامِ روحانیت پر بلوۃِ نورانیت سے مستفیض کر دیا، وَالْإِنْسَانُ الْمَصْبِيُّ (۶۴) اور اسی کی طرف لوٹ کر جاتا ہے، اس کے معنی ہیں کہ یہ ساری ترقی جو ظاہر سے لے کر باطن تک ہوتی ہے خدا کے حضور جانے کے لئے ہے۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قَلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدْ وَالْأَدَمَ (۱۷۱) اس میں شک ہی نہیں کہ ہم نے تم کو پیدا کیا (یعنی جسمانی تخلیق مکمل کر دی) پھر تمہاری روحانی صورتیں بنائیں، پھر ہم نے فرشتوں سے کہا کہ تم سب کے سب آدم کو سجدہ کرو۔ اس آیتِ کریمہ میں بطریقِ حکمت تمام آدموں یا انسانوں کی جسمانی تخلیق اور روحانی صورت کی تکمیل کا یکجا ذکر فرمایا گیا ہے، اور اس میں سب پر یکساں احسان ہونے کا اشارہ ہے، اور ہر حالت میں روحانی صورت کی تکمیل کے بعد خدا فرشتوں سے فرماتا ہے کہ آدم کو سجدہ کرو، جس سے روحانی صورت کی معنویت و اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

آپِ قِصَّةِ مَرْيَمَؑ میں اس نقطہ نظر سے دیکھ سکتے ہیں کہ رُوحِ الْقُدُسِ یعنی جبرائیلؑ جس کو رُوحِ خُدا کے عظیم مائٹل سے نوازا گیا ہے وہ ایک کامل اور مکمل انسان کی صورت میں حضرت مریمؑ کے سامنے ظاہر ہو جاتا ہے (۱۹) پس اگر ہم رُوحِ خُدا وندی یا نورِ خُدا وندی کی اُس مثال کو ایک اعتبار سے صورتِ رحمان اور دوسرے اعتبار سے صورتِ انسان قرار دیں تو اس میں کون سی منطقِ خلافِ قرآن اور غلط ہو سکتی ہے،

اور اگر اس قصہ کے مطابق رُوحِ خُدا کا انسانی شکل اختیار کر لینا ایک قرآنی حقیقت ہے تو یہ بھی بالکل درست ہے کہ حضرت آدمؑ اپنے زمانے میں صورتِ رحمان تھے، کیونکہ آپ میں بھی خُدا کی وہی رُوح تھی، جس نے مُستقل طور پر آپ میں انسانی صورت اختیار کر لی تھی، وہی رُوحِ قدسی جو بعد میں مریمؑ کے سامنے آئی، اور ان کے کانوں سے داخل ہوئی، اور وہی جو حضرت عیسیٰؑ کی ظاہری اور باطنی صورت میں تھی۔

اس ربطِ حکمت سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیان ہو جاتی ہے کہ ہر پیغمبر اور ہر امام یقیناً صورتِ رحمان ہوا کرتا ہے، کیونکہ جو خُدا کی رُوح حضرت آدمؑ کی پیشانی میں جلوہ گر تھی، اسے ہم رُوحِ خُدا کہیں یا نورِ خُدا، اس میں کوئی فرق نہیں، مگر امرِ واقعی یہ ہے کہ اس کا سب سے اہم مقصد بنی نوعِ انسان کی ہدایت کرنا تھا، لہذا خُداوندِ عالم نے اپنی پاک رُوح کو ہمیشہ کے لئے سلسلہٴ ہدایت سے وابستہ کر دیا ہے، پس زمانے کا ہادی برحق خُدا کی رُوح اور صورتِ رحمان کا درجہ رکھتا ہے۔

سوال: صورتِ رحمان کی اس مثال میں لفظ ”صورت“ کو اتنی

بڑی اہمیت کیوں دی گئی ہے؟

جواب: کیونکہ یہ چہرہٴ خُدا کے معنی میں آیا ہے، جس کا دوسرا

لفظ قرآن میں ”وجہ اللہ“ ہے جو روحانیت کا انتہائی عظیم مرتبہ اور قرآن حکیم کا سب سے اہم موضوع ہے، اور اس حقیقت کی دلیل یہ ہے کہ عقلی یا رُوحانی طور پر فناء ہو جانے کے لئے کوئی درجہ نہیں، مگر

وجہ اللہ ہے، جیسا کہ خدا کا کلام ہے: **كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهًا لَّهِ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ** (۲۸) چہرہ خدا کے سوا ہر چیز ہلاک ہو جانے والی ہے، حکم اسی کا ہے اور تم اسی کی طرف لوٹاتے جاؤ گے۔ اس حقیقت کی دوسری دلیل یہ ہے: **كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ**، **وَيَبْقَىٰ وَجْهَ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ** (۲۴-۲۵) جو مخلوق اُس (زمینِ ظاہر اور زمینِ روحانیت) پر ہے وہ سب فنا ہو جانے والی ہے مگر تمہارے پروردگار کا چہرہ جو جلالت و کرامت والا ہے باقی رہے گا۔ اس کی ایک ظاہری مثال قصہ حضرت نوح علیہ السلام سے مل سکتی ہے، کہ آپ اپنے زمانے میں چہرہ خدا تھے، لہذا اس وقت کے فرمانبردار مومنین آپ سے وابستہ ہو کر جلالت و کرامت کے ساتھ زندہ جاوید ہو گئے، اور جو لوگ نافرمان تھے، وہ روحانی موت سے ہمیشہ کے لئے مر گئے، اور عقل والے جانتے ہیں کہ طوفان اور ہلاکت صرف زمانہ نوح کے لئے خاص نہیں، یہ تو پوشیدہ پوشیدہ ہر زمانے میں آتا رہتا ہے۔

انبیاء و ائمہ علیہم السلام کے عالمِ شخصی کو عالمِ ذریعہ بھی کہا جاتا ہے، جس میں ازل سے لے کر ابد تک جملہ واقعات و حالات فعلاً موجود ہیں تاکہ اہل روحانیت کے لئے عملی تاویل اور کامل معرفت کے وسائل مہیا ہوں، ہر جملہ اس میں لازمی طور پر انفرادی قیامت بھی برپا ہو جاتی ہے، جس میں اجتماعی قیامت کا مکمل نمونہ پایا جاتا ہے، وہ قیامت ہی ہے

واقعہ آدمؑ بھی ہے اور طوفانِ نوحؑ بھی، غرض وہ ایک ایسی جامع الجوامع مثال ہے کہ اس کے احاطے سے کوئی علمی اور عرفانی شے باہر نہیں چھوڑتی۔ وہاں بحکمِ خداوند تعالیٰ جب اسرافیلؑ صور بھونکتا ہے، تو اس کی معجزاتی آواز سے تمام لوگ خواہ مُردہ یا زندہ بصورتِ ذراتِ لطیف اُن حاضر ہو جاتے ہیں، پھر اس سلسلے کے ایک مرحلے میں جا کر چہرہٴ خُدا (مادنی زمان) کے سوا سب فنا ہو جاتے ہیں، اور یہ فنا دو طرح کی ہوتی ہے: فنا برائے فنا، اور فنا برائے بقا، اس کی مثال کسی پُرانی عمارت کو گرا دینے کی طرح ہے، کہ اس کے گرا دینے کا مقصد یا تو ختم ہی کر دینا ہوتا ہے یا از سر نو تعمیر کرنا۔

سوال: اس میں کیا حکمت اور کیا راز ہے کہ قرآنِ حکیم میں جہاں سب لوگوں کے فنا یا ہلاک ہو جانے کا ذکر فرمایا گیا ہے وہاں چہرہٴ خُدا کا تذکرہ بھی موجود ہے؟

جواب: فنا تے مخلوق اور چہرہٴ خُدا کا یکجا ذکر اس لئے ہے کہ جس طرح کسی شخص کی پہچان اس کے چہرے سے ہوتی ہے، اسی طرح خُداوند کریم کی معرفت (پہچان) بھی اس کے چہرے سے حاصل ہو سکتی ہے چنانچہ ذاتِ سبحان نے ہر پیغمبر اور ہر امام کو اپنا پاک چہرہ قرار دیدیا، کیونکہ معرفتِ توحید انہی پاکیزہ ہستیوں کے وسیلہٴ ہدایت کے بغیر کسی کو کہیں سے مل نہیں سکتی تھی، سو یہی سبب ہے کہ لوگوں کو قیامت میں چہرہٴ خُدا کے حضور میں حاضر کیا جاتا ہے، تاکہ اُن سے متعلقہ سوالات

کئے جائیں اور فیصلہ اس حقیقت کی روشنی میں ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک ناموں میں سے ایک
 «الْبَيْتَةُ ۹۸» بھی ہے، جس کے مطابق آپ ہی معجزہ اور دلیلِ روشن
 ہیں، اور ہر زمانے کا امامِ انہی معنوں میں خلیفۃ رسول ہے، اب
 قرآنِ حکیم (۴۲) میں ذرا غور سے دیکھ لیجئے، کہ زمانۂ نبوت کے بعض
 لوگ جسمانی طور پر مرنے سے قبل کس طرح دلیل سے یعنی عقل کی نظر میں
 مر چکے ہوتے تھے، اور بعض دوسرے لوگ کس طرح اسی قانونِ عقل کے
 مطابق صحیح معنی میں زندہ ہو چکے ہوتے تھے، پس یہی مثال قیامت
 کے لئے بھی ہے کہ جو شخص دنیا میں چہرہٴ خدا کی نافرمانی سے
 بحدِ قوت مر گیا ہو اس کو دائمی فنا کی غرض سے فنا کر دیا جائے،
 اور جو بندہ چہرہٴ خدا کی فرمانبرداری سے بحدِ قوت حیاتِ روحانی
 پاپکا ہو اسے ابدی بقا کے لئے فنا کر دیا جائے، اور ان دو
 حالتوں کی بنیاد چہرہٴ خدا سے لوگوں کی دشمنی اور دوستی ہے۔

سوال: مسلمین اور مومنین یا اہل نجات کو چہرہٴ خدا میں کس طرح
 فنا فی اللہ وبقا باللہ کا انتہائی عظیم درجہ حاصل ہو جاتا ہے؟
 جواب: یہ سب سے بلند ترین مرتبہ صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت
 ہی سے حاصل ہو سکتا ہے، چنانچہ حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان
 ہے: يَا بَنِي آدَمَ اطعني اجعلك مثلي حياً لا تموت....
 اے ابنِ آدم میری اطاعت کر تا کہ میں تجھ کو اپنی مثال پر ہمیشہ زندہ

رہنے والا (اور) کبھی نہ مرنے والا بناؤں گا۔ اس پاک و پاکیزہ حدیث سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ شرطِ فنا برائے ابدی بقا اطاعت ہے، جو تین درجات پر مبنی ہے، خدا کی اطاعت، رسول کی اطاعت اور صاحبانِ امر کی اطاعت (۹۴) اس حکم کے مطابق فنا کے بھی تین درجے ہیں:

فنا فی اللہ، فنا فی الرسول اور فنا فی الامام، اس ترتیب سے ظاہر ہے کہ نیچے سے اوپر جانے کے لئے سب سے پہلے امام میں فنا ہو جانا ہے۔

روحانی ارتقاء کے چار بڑے مراتب یا چار عالم مشہور ہیں، جو ناسوت، ملکوت، جبروت اور لاهوت ہیں، اگر ہم بندۂ مومن کی عالمِ ناسوتیت کی فنا کو بھی تسلیم کریں تو ہر عالم میں ایک فنا کا ہونا ضروری قرار پاتے گا، اور امر واقعی بھی یہی ہے، پس مقامِ مومن ناسوت ہے، منصبِ امام ملکوت، درجۂ پیغمبر جبروت، اور مرتبہ خدا لاهوت ہے، جن میں سے ہر ایک عالم میں مومن فنا ہو جاتا ہے۔

اب کیفیتِ فنا کا ذکر کرنا ضروری ہے :-

۱۔ خدا و رسول اور ولی امر (امام زمان) کی اطاعت و فرمانبرداری میں آگے سے آگے بڑھ جانا، اپنے باطن میں اللہ، پیغمبر اور امام وقت کی حقیقی محبت اور کامل عشق پیدا کرنا، اور دینِ حق کے لئے اپنے دل میں ایک مکمل جذبہ جانفاری رکھنا، ایسا ہے، جیسے مومنین بقول قرآن (۱۹۵) جیتے جی راہِ خدا میں شہید ہو چکنے کا درجہ رکھتے ہیں یہ بحد قوت "فنا فی الامام"

کا درجہ ہے۔

۲۔ آپ عالم شخصی یا عالم ذر کے بارے میں بہت سی عجیب و غریب باتیں جانتے ہوں گے، چنانچہ نورِ امامت میں حکیم : **وَكُلُّ شَيْءٍ اَحْصَيْنَاهُ فِي اِمَامٍ قَدِيمٍ** (۳۶) ہر عقل، ہر روح اور ہر ذرہ وی جسم (ذرہ لطیف) موجود ہے، کیونکہ امام زمانہؑ میں ہر چیز اُس وقت فنا ہو جاتی ہے (۷۸) جبکہ آپؑ کی انفرادی قیامت قائم ہو جاتی ہے، مگر یہ تسلیم و فطوعاً و کرہاً ہے (۸۳) یعنی یہ معاملہ خوشی کا بھی ہے اور زبردستی کا بھی۔

۳۔ حکمتِ قرآن کی روشنی میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ”فنا“ خاص ہے اور ”ہلاک“ عام، ہر چند کہ دونوں حالت میں چہرہٴ خدا کا ذکر آیا ہے، مگر دونوں کے درمیان بڑا فرق پایا جاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ فنا جن و انس (مخلوقِ لطیف و کثیف) کے لئے مقرر ہے، جس کے نتیجے میں ان کو ربّانی جلالت و کرامت کی صفات میں زندہ ہو جانے کی ہمتیال نعمتیں حاصل ہو جاتی ہیں، اور ہلاک ہر چیز یعنی مخلوقِ عام کے لئے ہے جس کا مقصد فیصلہ کرنا اور رجوع ہو جانا ہے۔

۴۔ فرمایا گیا ہے : **ما خلقکم ولا بعثکم الا کنفسٍ وَّاحِدَةٍ** (۳۱) تم سب کا پیدا کرنا اور پھر (فنا کے بعد) بجلا اٹھانا ایک روح کی طرح ہے۔ یاد رہے کہ اُس آیہ مقدّسہ میں انتہائی بلند ہی کی حکمتیں پوشیدہ ہیں، کیونکہ اِس فرمانِ الہی میں لوگوں کی جسمانی تخلیق اور عام تصوّرِ قیامت کا ذکر نہیں، بلکہ یہاں ان کی اُس مجموعی روحانی تخلیق کا بیان

ہے، جو عالمِ ذر کے ذرات میں ایک ساتھ مکمل ہو جاتی ہے، جس کی وضاحت یوں ہے کہ جب انسانِ کامل کی انفرادی قیامت میں مجملہ ارواح کی اجتماعی قیامت برپا ہوتی ہے، تو اُس وقت تمام لوگ بشکلِ ذراتِ عالمِ ذر میں حاضر ہو جاتے ہیں، اور یہ اُن کی رُوحانی خلق ہے، عالمِ ذرِ امامِ زمان (انسانِ کامل) کا شخصی عالم ہے، نفسِ واحد کا مطلب نفسِ کلّی ہے، جو امام کی عظیم رُوح ہے، نفسِ واحد کے معنی ایسی رُوح ہیں، جو فی ذاتہ ایک ہے اور دوسری تمام جزوی رُوحوں کو اپنے وجود میں ایک کر لیتی ہے، جبکہ واحدہ بر وزنِ فارعلہ کے یہی معنی ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ دونوں قسم کی مخلوق شعوری اور غیر شعوری طور پر صورتِ رحمان یعنی چہرہ خدا میں فنا ہو کر اصل میں داخل ہو جاتی ہیں، مگر اُس درجہ اعلیٰ میں خود کو بیدار پانے کے لئے کامل معرفت لازمی ہے۔

۵۔ جو مومنین امامِ زمان کو اپنی سب سے عظیم رُوح مانتے ہیں، تو عالمِ ذر ان کے نام پر ہو جاتا ہے، جس میں سب کچھ ہے، کیونکہ امام کی عقل ہی عقلِ کلّی ہے، اس کی رُوح ہی نفسِ کلّی ہے اور اُس کا جُستہ، ابداعیہ جسمِ کلّی ہے، لہذا کائنات و موجودات کی مجملہ اشیاء امام برحق کی ذاتِ اقدس میں فنا اور محو د ہیں، پس لوگوں کی خلق و بعث امام میں ہے۔

سوال : ویسے تو ہرغمیر اور ہر امام بحکم خداوند تعالیٰ اپنے وقت میں سلیمانؑ کی طرح رُوحانی سلطنت کا بادشاہ ہوا کرتا ہے، کیونکہ ان سب حضرات کی رُوحانیت ایک جیسی ہے، پھر اس کا سبب کیا ہے کہ صرف سلیمان ابن داؤدؑ کی باطنی اور رُوحانی بادشاہی کا ذکر نمایاں طور پر فرمایا گیا ہے؟

جواب : جی ہاں، ان سب حضرات کی ضروری رُوحانیت ایک اور مشترک ہے، اور ہر ایک اپنے زمانے کا نفسِ واحدہ ہوا کرتا ہے، مگر اس کی مثالیں زمان و مکان کی حکمت و مصلحت کے مطابق پیش کی گئی ہیں، اور اس میں لوگوں کو آزمانا بھی مقصود ہے، لہذا اس قانون کے مطابق رُوحانی سلطنت کی مثال پیش کرنے کا فریضہ حضرت سلیمانؑ کو سونپا گیا، اور نتیجے کے طور پر جنّ و انس وغیرہ آپ میں عقلاً و رُوحاً فنا ہو گئے۔

فقط علمی خادم :-

نصیر الدین نصیر ہونزائی

لندن : ۳۰ جولائی ۱۹۸۳ء

بُنیادی اور آخری حقائق

۱۔ اگر کہا جاتے کہ سب سے پہلے عرش تھا، تو یہ بات بالکل صحیح ہوگی، کیونکہ قرآن حکیم میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق کا ذکر فرمایا گیا ہے، مگر تخلیق عرش کا کوئی تذکرہ نہیں، اس لئے کہ عرش عظیم دائرۃ عالمِ خلق سے باہر اور بالاتر ہے، اور اس لئے کہ وہ عالمِ امر ہے، جس میں ابداع ہے، مگر تخلیق نہیں۔

۲۔ اگر مان لیا جاتے کہ عرشِ رحمان کا ظہورِ خاص انسانی صورت میں ہے جو اہل میں رحمان ہی کی صورت ہے، تو اس سے عظیم اور پاک جنتہ من ابدلیۃ مراد ہوگا جو آیتنہ من مبدرع اور مبدرع ہے، اور یہی نہ صرف مرتبہ اول و آخر ہے، بلکہ ظاہر و باطن بھی ہے۔

۳۔ اگر ہم اس حقیقت کو تسلیم کریں، کہ بجد قوت ہر انسان کی ایک ذاتی اور انفرادی کائنات بھی ہے، تو اس صورت میں یقیناً قرآن حکیم کا وہ تذکرہ جو تترتلی معنی میں اس ظاہری اور مادی کائنات کے بارے میں ہے، وہ آدم اور آدمی کے شخصی عالم سے متعلق قرار پائے گا، اور

آفرینش کا درست تصور یہی ہے۔

۴۔ آفاق اور انفس کے آپس میں حقیقی رشتہ یہ ہے کہ ظاہری کائنات کو روحانی شکل دے کہ انسان کے باطن میں سما دی گئی ہے، اور انسان کی عظمت و بزرگی کی حقیقت بصورتِ کتاب کائنات ظاہر میں پھیلائی ہوئی ہے، پس یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ جس طرح عالمِ صغیر (انسان کی ذاتی دنیا) انسانی صورت میں محدود ہے، اسی طرح عالمِ کبیر (رحمانی صورت میں محدود ہے، جو عرشِ عظیم اور پیکرِ نور ہے۔

۵۔ سورۃ رحمان کے ایک پر حکمت ارشاد کا یہ مفہوم ہے کہ سیارۃ زمین پر بسنے والے تمام انسان جو طرح طرح کی اموات سے فنا ہو جانے والے ہیں، وہ چہرۂ خدا یعنی پیکرِ نور (جُستہ ابداع) میں داخل ہو جائیں گے، اور اُن پر اللہ تبارک و تعالیٰ کا یہ سب سے بڑا احسان اس بات کا روشن ثبوت ہے کہ وہ جلالت و کرامت اور نعمت کا مالک ہے (۲۷۶-۲۸۵)۔

۶۔ قرآن اپنی خاص تاویلی زبان میں بتا دیتا ہے کہ ذاتی اور انفرادی روحانیت کی کائنات ہمیشہ چھ دن میں مکمل ہو جاتی ہے، یعنی دو دن میں روحانیت کی زمین، دو + دو = چار دن میں روحانیت کے پہاڑ، اور دو دن میں آسمان بن جاتے ہیں، ابتدائی دو دن سے حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کی روحانیت مُراد ہے، چار دن کے معنی ہیں حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ،

جن کی رُوحانیت کے دوران رُوحانی پہاڑ پیدا کئے جاتے ہیں اور دودن حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفیٰؐ ہیں، جن کی رُوحانیت کی مُدت میں ذاتی دُنیا کے آسمان بنائے جاتے ہیں (۹-۱۷)

۷۔ خداوند تعالیٰ نے نہ صرف انسان کی ذاتی دُنیا ہی کو چھ دن میں مکمل کر دیا بلکہ اُس نے عالمِ دین کو بھی چھ بڑے دنوں (ادوار) میں بنایا، یعنی آدم، نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور حضرت محمد صلوات اللہ علیہم کے چھ ادوار میں عالمِ دین کُلّی طور پر مکمل ہو گیا۔

۸۔ اگر قرآنی حکمت میں نظرِ غائر دیکھا جاتے، تو اس حقیقت سے آگہی ہوگی کہ وجودِ عرش کا ذکر زمین و آسمان کی تخلیق سے پہلے بھی آتا ہے اور بعد میں بھی، اس کی وجہ یہ ہے کہ شخصی رُوحانیت اور عالمِ دین کا سفر ایک دائرے پر واقع ہے، جس کے نقطہ آغاز کا تعلق عرش سے ہے اور منزلِ مقصود بھی عرش ہی سے متعلق ہے، چنانچہ رُوحانی سفر کے درجہ آخر میں پیکرِ نور کی صورت کا تجربہ ہوتا ہے کہ وہ مُبدع بھی ہے اور مُبدع (عرش) بھی۔

۹۔ قانونِ "کن" کے مطابق بلا تاخیر جسمِ لطیف اور رُوح کو کوئی مشکل دینے کا نام ابداع ہے، اور یہ فعلِ مُبدع یعنی پیکرِ نور کا ہے، مگر اس کا تصور ہرگز ایسا نہیں کہ یہ صرف ایک بار واقع ہو چکا ہو، بلکہ یہ ہمیشہ کے لئے ہے، اگر ابداع کا فعل صرف ایک بار ہو گزرا ہوتا، تو اُس صورت میں خدا تعالیٰ کی قدرت میں زبردست تنگی و کمی واقع ہو چکی ہوتی لیکن یہ بات غیر ممکن ہے۔

۱۰۔ قصہٴ مریمؑ میں بطریقِ حسن غور کیا جاتے: مریم نے لوگوں سے دور پرودہ (بطریقِ تقیہ) خصوصی عبادت کا راستہ اختیار کر لیا، تو خدا تعالیٰ نے اس کی طرف اپنی رُوح القدس یعنی جبرائیل کو بھیجا، جو فعلِ ابداع سے ایک کامل و مکمل انسان کی صورت (یعنی جنتہٴ ابداعیہ) میں مریمؑ کے سامنے ظاہر ہوا (مفہوم: ۱۹)۔ پس اگر ابداع کا تعلق صرف ایک بار کے لئے ازل سے ہوتا یا یہ صرف عالمِ امر میں محدود ہوتا تو بنی مریمؑ پر ابداع کا یہ معجزہ نہیں گزرتا۔

۱۱۔ حضرت سلیمانؑ نے اپنے حدودِ دین کے حدودِ اروں سے کہا کہ تم میں سے کون ایسا ہے جو ملکہٴ سبا کے فرمانبردار ہو کہ یہاں آنے سے قبل ہی انتہائی جلدی سے اس کے تخت (یعنی جنتہٴ ابداعیہ) کو میرے پاس لا سکتا ہے؟ تو جنات میں سے ایک عنقریب (یعنی لطیفِ حدود میں سے ایک طاقتور شخص) نے کہا کہ میں اسے آپ کے اپنی جگہ سے کھڑے ہو جانے سے پہلے ہی لا حاضر کر دوں گا اور اُس نے ایسا ہی کر دکھایا، اس کے اوپر کے درجہ میں ایک اور ابداع تھا جس کے متعلق حدودِ لطیف کے اس شخص نے کہا، جس کے پاس کتابِ روحانیت کا ایک خاص علم تھا کہ میں اس کے تخت (جنتہٴ ابداعیہ) کو چشمِ زدن میں حاضر کر دوں گا، چنانچہ اُس نے ایسا کر دیا، جب حضرت سلیمانؑ نے مُبدع کا یہ کمال دیکھا کہ ایک مُبدعِ مستقر اس کے سامنے تھا، تو کہا کہ یہ میرے پروردگار کے فضل سے ہے (مفہوم: ۳۸-۳۹)۔ اس سے ظاہر ہے کہ کیفیتِ کائناتِ آخری درجہ ابداع ہے۔

۱۲۔ پیکر نورانی ایک ایسا مقام ہے کہ وہاں تمام اعلیٰ حقیقتیں ازلی وابدی طور پر جمع ہیں، چنانچہ یہی نفسِ کلّی اور نفسِ واحدہ ہے، جہاں پر انسان ایک مستقل وجود رکھتا ہے، جس کے بارے میں حدیثِ قدسیٰ کا ارشاد ہے کہ: **يَا بَنِي آدَمَ اطِيعْنِي اِجْعَلْكَ مِثْلِي حَيًّا لَا تَمُوتَ ... الخ**۔ اے ابن آدم میری اطاعت کرتا کہ میں تجھ کو میری اپنی ذات کی طرح لازوال اور غیر فانی بنا دوں گا۔ ربِّتِ کریم کے اس احسانِ عظیم کے یہ معنی ہیں کہ انسان کی اساسی اور آخری حقیقت ہمیشہ پیکرِ نور میں موجود ہے، بدین سبب حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ نے مونوریا لئزم (حقیقتِ واحدہ) کا تصور پیش کیا ہے۔

۱۳۔ خدائے پاک کا پُر حکمت ارشاد ہے: **وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَفِجٍ بِالْبَصَرِ (۵۲)** اور ہمارا امر (یعنی کلمہ کن حقیقت میں) آنکھ کے جھپکنے کی طرح ایک ہے۔ یعنی اگرچہ انفرادی روحانیت کے درجات عالیہ پر ظہورِ حقائق و معارف کے لئے کلمہ امر کا وقوع بار بار ہوتا رہتا ہے، لیکن وہ مثالِ زمان و مکان سے بالاتر مقام وحدت پر ہے، لہذا وہ ہر اعتبار سے ایک ہی ہے، اور گوہرِ عقل میں حقائقِ اشیا کی وحدت کو ظاہر کرتا ہے۔

۱۴۔ اللہ تعالیٰ کا برحق فرمان ہے: **وَكَانَ امْرًا لِلَّهِ مَفْعُولًا (۳۳)** اور خدا کا امر (کلمہ کن) کیا کرایا ہوا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کے مستقبل اور موت کے بعد جتنی چھوٹی بڑی چیزیں

امرکن سے ظہور پزیر ہو جانے والی ہیں، ان میں سے کوئی شے نئی نہیں، کیونکہ ہر چیز وہی ہے جو پہلے سامنے آئی تھی، نہ تو قیامت کوئی جدید واقعہ ہے اور نہ ہی بہشت کوئی نیا مقام، مگر ہاں، ہر چیز میں جدت پیدا ہو جانے کے لئے یہی قانونِ فطرت بنا ہوا ہے کہ وہ چیز زمان و مکان کے اس دائرہ وسیع پر جس کی ابتدا و انتہا نہیں گھوم گھوم کر سامنے آجاتی ہے۔

۱۵۔ آیہ مذکورہ بالا کے بموجب خدا کی بادشاہی میں جہاں ہو جا

رکن، کا مقدس فرمان ازل سے محیط ہے، وہاں عدم محض (یعنی کسی چیز کی قطع نستی) کا تصور غیر ممکن ہے، مگر یہ درست ہے کہ ایک اعتبار سے عالم امر کی تشبیہ نستی سے دی گئی ہے، کیونکہ وہ ایک پوشیدہ جہان ہے، جس کی کسی شے کا ظہور ”کن“ سے ہو جاتا ہے، اس کے یہ معنی ہوتے کہ کلمہ ”کن“ کا اصل مقصد پوشیدگی سے کسی چیز کا ظاہر ہو جانا ہے، اور ایسے ظہور کا تعلق نہ صرف دیدہ دل سے ہے بلکہ چشمِ ظاہر سے بھی ہے۔

۱۶۔ قرآن حکیم کا اصولِ حکمت بڑا عجیب و غریب اور بدرجہ

کامل جامع ہے، یہاں مثال کے طور پر غور کیا جاتے: اور ہم نے انسان کو گیلی مٹی کے جوہر سے خلق کیا (یعنی انسان پہلے پہل ذراتِ لطیف میں اپنا روحانی وجود رکھتا ہے) پھر ہم نے اس کو نطفہ بنا کر ایک جگہ (عورت کے رحم) میں رکھا، پھر ہم ہی نے نطفہ کو جما ہوا خون بنایا، پھر ہم ہی نے منجمد خون کو گوشت کا لہو تھرا بنایا، پھر

ہم ہی نے لوتھڑے کی ہڈیاں بنائیں پھر ہم ہی نے ہڈیوں پر گوشت پیرٹھا یا، پھر ہم ہی نے اس کو خلقِ آخر کی صورت میں، انشاکیا، تو (سُبْحَانَ اللّٰهِ) خدا بڑا بابرکت ہے جو سب بتانے والوں سے بہترین ہے (۱۲-۱۴) اس ربّانی تعلیم میں کئی تو سب طلب نکات ہیں، چنانچہ: "وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةِ مِّنْ طِيْنٍ" سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کو تخلیق کے مرحلہ اول پر جو ہر خاک کی صرف ایک ہی عنصروں سے پیدا کیا گیا ہے، جس طرح بجن کو جوہر آتشی کے عنصروں سے بنا یا گیا ہے، تخلیق انسانی کے اس مقام کا ایک خاص نام عالمِ درجے جس میں تمام انسان بصورتِ ذراتِ لطیف رہتے ہیں، آفرینش انسان کی منزل ہنتم پر خلقِ آخر کا ذکر آیا ہے اور اس سے جنتہ ابداعی مراد ہے، اور اسی کی طرف خداوند کی صفت "احسن الخالقین" کا اشارہ ہے۔

۱- آسمان سات ہیں، زمین بھی سات ہیں (۱۴/۶۵) ایام ہفتہ سات

ہیں، صاحبانِ ادوارِ مہین (حضرت آدم، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، حضرت محمد مصطفیٰ اور حضرت قائم صلوات اللہ علیہم اجمعین) سات ہیں، اور صاحبانِ ادوارِ کہین بھی سات ہیں یعنی ہر چھوٹے دور کے آئمہ ظاہرین علیہم السلام، اسی طرح جسمانی اور روحانی تعمیر و تکمیل کے مراحل بھی سات سات ہیں، اور وہ یہ ہیں:-

۱- سلالہ / جوہرِ خاک

۲- نطقہ

۳۔ علقہ / منجند خون

۴۔ مُضغہ / گوشت کا لوتھڑا

۵۔ عظام / ہڈیاں

۶۔ لحم / گوشت

۷۔ خلق آخر / مکمل تخلیق۔

۱۸۔ مذکورہ بیان میں جو جو چیزیں سات نمبر پر واقع ہیں، ان کے آپس میں مناسبت پائی جاتی ہے، یعنی آسمان ہفتم، زمین ہفتم، سینچر کا دن، حضرت قائم ۴، ہر ساتواں امام ۴، اور خلق آخر، جو جسم لطیف ہے، اس مناسبت کے یہ معنی ہیں کہ آسمان ہفتم حضرت قائم ۴ ہے، زمین ہفتم آپ کا حجت ہے، سینچر کی تاویل بھی قائم ہے، ہر ساتواں امام ایک طرح سے قائم ہے اور وہ قائم کے ایک اہم کام کو انجام دیتا ہے، اور خلق آخر کے مقام پر حضرت قائم ۴ کی شناخت حاصل ہو جاتی ہے۔

۱۹۔ چونکہ تمام چیزیں اپنے اپنے دائرے پر واقع ہیں، اس لئے حضرت قائم ۴ حضرت آدم سے اس طرح بلا ہوا ہے جس طرح سینچر اتوار سے جاملتا ہے، جیسے ہر ساتواں امام پہلے امام سے جاملتا ہے، اور جیسے خلق آخر یعنی حجتہ ابداعی عالم دوسرے متعلق ہے۔

۲۰۔ اس بات سے شاید آپ کو تعجب ہوگا کہ قرآن حکیم میں

اگرچہ بظاہر صرف ایک ہی آدم کا ذکر ملتا ہے، لیکن باطن اس میں لاتعداد آدموں کا تذکرہ موجود ہے اس کی مثال اسم "انسان" ہے جو قرآن پاک میں بصدغہ واحد مذکور ہے مگر یہ اپنے معنی میں تمام انسانوں

کی نمائندگی کر رہا ہے۔

۲۱- آسمان، زمین، سورج، چاند، ستارے، دن رات، پانی، ہوا،

درخت، حیوان اور انسان سب اپنے اپنے دائرے پر گردش کر رہے ہیں، ہاں سورج کائنات کے وسط میں ساکن تو ہے، مگر وہ ایک طرف سے بڑی سرعت کے ساتھ تحلیل شدہ مواد کی صورت میں خارج ہوتا رہتا ہے اور دوسری طرف سے ایندھن کی شکل میں اپنی بھٹی میں داخل ہو جانے کا سلسلہ جاری رکھتا ہے، اسی طرح وہ بھی گردش میں ہے، درخت بیج سے ہے اور بیج درخت سے، حیوان اور انسان نطفہ سے ہیں اور نطفہ اُن سے، اسی بیج پر ہر چیز گردش کرتی رہتی ہے، پس اس قانونِ فطرت سے ظاہر ہے کہ خدا کی پادشاہی میں ہر طرف لا ابتدائی اور لا انتہائی ہے۔

نصیر الدین نصیر

لندن - مورخہ ۱۲ جولائی ۱۹۸۳ء

عالمِ شخصی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ - خُداوند! خُداوند! تیرے حضورِ
 اقدس اور تیری بارگاہِ عزت سے تائید و دستگیری مطلوب ہے، پروردگار!
 اپنی عنایتِ بے نہایت سے اس بندۂ مسکین و خاکسار کو توفیق عطا
 فرما کہ یہ ناپیڑ ہمیشہ خود کو خاک پاتے مومنان سمجھ رکھے، آمین یارب
 العالمین!

عالمِ شخصی ایک انتہائی دلچسپ اور بید مفید موضوع ہے،
 کیونکہ یہ فرمانِ مبارک ”مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ
 رَبَّهُ“ کے تحت آتا ہے، مگر یہ معلوم نہیں کہ مجھ ایسے بے مایہ درویش
 کے الفاظ کیسے ہوں گے، تاہم رحمتِ خُداوندی پر اُمید رکھنا
 بھی ضروری ہے، بہر کیف ”عالمِ شخصی“ خُداوند تعالیٰ کے نیک بندوں
 کے لئے ایک اُمید افزا تصور ہے، اس ذاتی دُنیا (PERSONAL
 WORLD) کے کئی دوسرے نام بھی ہیں، جیسے عالمِ صغیر، عالمِ نفسی،
 ذاتی دُنیا، عالمِ روحانیت، عالمِ باطن وغیرہ، ہر عظیم حقیقت کے

بہت سے نام ہوا کرتے ہیں، مگر اس کا کام ہمیشہ ایک جیسا رہتا ہے۔
 تصویر آفرینش کی حقیقت کیا ہے؟ خدا نے عالم دین کو کس طرح
 پیدا کیا؟ پیغمبر اور امام کی حقیقی شناخت کا وسیلہ کیا ہے؟ انسان
 کی حدودِ رسائی کہاں کہاں تک ممکن ہیں؟ رُوحِ مومن اور رُوحِ قرآن
 کے آپس میں کیا رشتہ ہے؟ انسان کی ذاتی دنیا کا ذکر قرآن
 میں کہاں کہاں یا کس طرح ہے؟ ان جیسے بہت سے سوالات کے
 جوابات عالمِ شخصی کے اس موضوع میں داخل و شامل ہیں۔

حضرت مولانا مرتضیٰ علی صلوات اللہ علیہ کے پُر حکمت ارشاد
 ”مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ“ میں دو باتیں
 بنیادی اہمیت کی حامل اور قابلِ توجہ ہیں، ایک یہ فرمانا کہ خدا
 کی معرفت خود انسان کی ذات میں پوشیدہ ہے، دوسرا یہ حکم کہ
 معرفت کا لگاؤ اسم ”رب“ سے ہے، رب (یعنی پرورش کرنے
 والا) تو ساری کائنات و موجودات کا ہے، مگر معرفت صرف یہ دیکھنے
 اور معلوم کر لینے سے حاصل ہوگی کہ اشارۃً ”ربہ“ کے مطابق خدا
 انسان کی عقلی، علمی اور روحانی پرورش کس طرح کرتا ہے، جس کے
 لئے عالمِ شخصی کے مقاماتِ روحانی اور درجاتِ عقلی کا مطالعہ و مشاہدہ
 کرنا ہوگا، کیونکہ وہاں رب العزت کی مجملہ صفات کے علمی و عرفانی
 ظہورات ہوتے رہتے ہیں۔

جی ہاں، معرفت کا تعلق اسمِ رب سے ہے، اور رب کی

رُبُوبِيَّتِ وہ صفت ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اپنی ذات کی تعریف کرتے ہوئے فرماتا ہے: **الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ** یعنی سب تعریف اللہ کی ہے جو کائنات، عالم دین اور عالم شخصی کا پروردگار ہے، اگر مولا علیؑ کے نزدیک عالم شخصی میں کائناتِ ظاہر اور عالم دین کی تمام مثالیں جمع نہ ہوتیں اور اس میں صفتِ رُبُوبِيَّتِ کا ہر گونہ ظہور نہ ہوتا تو آپؑ انسانی رُوح کو درسِ گاہِ معرفت کا درجہ نہ دیتے، اس سے یہ حقیقت ظاہر اور روشن ہو جاتی ہے کہ عوالم یا دُنیا میں خواہ اٹھارہ ہزار یا لاتعداد کیوں نہ ہوں لیکن عقل، رُوح اور جسم کی گونا گون تریبیت و پرورش کون کرتا ہے اور کس طرح، اس کا ثبوت اور کامل معرفت عالم شخصی میں ہے۔

قرآن حکیم میں جہاں جہاں اور جتنی بار تخلیق کائنات کا ذکر آیا ہے، اس میں بزبانِ حکمت ضروری طور پر شخصی دُنیا کا تذکرہ بھی موجود ہے، اور عالم دین کا تذکرہ بھی، کیونکہ یہ ظاہری کائنات اور اس کی حدود میں جو کچھ ہے وہ انسان کے لئے پیدا کیا گیا ہے، اور یہ کیسے مناسب و ممکن ہو سکتا تھا کہ ظاہری اور مادی دُنیا جو انسان کی خاطر ہے اس کی آفرینش کا ذکر فرمایا جاتے، مگر باطنی اور رُوحانی عالم جو خود انسان ہے اس کا تذکرہ نہ کرے، ایسا نہیں ہے بلکہ اس ہدایت نامہ سماوی میں جو بنی نوع انسان کی ظاہری و باطنی ترقی کی غرض سے نازل ہوا ہے دُنیا و آخرت کے بارے میں جو کچھ ارشاد

ہوا ہے اس کا براہ راست تعلق عالم انسان سے ہے کیونکہ خود انسان باعتبار جسم دُنیا ہے اور باعتبار رُوح آخرت۔

قرآن پاک میں لفظ ”عالمین“ جو عالم کی جمع ہے جس کا لفظی ترجمہ ”دُنیا تیں“ ہے، اس سے بقول حضرت امام جعفر الصادق علیہ السلام عالم انسان مراد ہے اور یہ بصورت جمع اس لئے ہے کہ ہر انسان بحد قوت یا بحد فعل ایک دُنیا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (۲۱-۱۰۰) اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت عوالم انسانیت کے لئے رحمتِ خداوندی ہیں، مگر حصولِ رحمت کی استطاعت میں سب انسان ایک جیسے نہیں ہو سکتے، لہذا صیغہ جمع لایا گیا، یعنی عالمین (انسانیت کی دُنیا تیں)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِّن

بعد الذکر أَنَّ الارضَ مِنْ ثَمَاعِبَادِي الصَّالِحِينَ (۱۰۵-۱۰۶) تاویل: اور ہم نے تمہیں ذکر کے بعد کتابِ روحانیت میں لکھ دیا کہ روئے زمین کے وارث ہمارے صالح بندے ہوں گے۔ زبور کتاب کو کہتے ہیں، اور یہاں کتابِ روحانیت مراد ہے جو روحانی ترقی کے بعد وجود میں آ سکتی ہے، اور اس کتاب میں لکھنا یہ ہے کہ بطورِ عملی نمونہ ایسے بندوں کو انفرادی عالم کی زمین کے وارث بنا دیا جاتا ہے تاکہ عظیم روحانی سلطنت کا یقین ہو سکے، اس سے ظاہر ہے کہ ذاتی دُنیا میں سب کچھ ہے اس میں آسمان و زمین اور ان کی ساری چیزیں موجود ہیں۔

قرآن کریم (۳۱۰) میں ارشاد ہے: کیا تم لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے (غرض سب کچھ) خدا ہی نے تم کو مسخر کر دیا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دیں اور لوگ ایسے بھی ہیں جو خدا کے بارے میں جھگڑتے ہیں (حالانکہ ان کے پاس) نہ علم ہے اور نہ ہدایت ہے اور نہ کوئی روشن کتاب ہے (۳۱۱) اس ربّانی تعلیم سے یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ جملہ کائنات انسان کے لئے مسخر کی گئی ہے، اور اس تسخیر کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ عالم ظاہر اور اس کی چیزیں مجموعاً انسان کے کام میں لگی ہوتی ہیں، اور دوسری صورت یہ ہے کہ کائنات اپنے اندر کی تمام اشیاء کے ساتھ بشکل لطیف انسان کے باطن میں سما گئی ہے اور اسی طرح تعجب ہے کہ عالم کبیر عالم صغیر میں محدود ہو گیا ہے، تاکہ خدا کی ظاہری اور باطنی نعمتیں پایۂ تکمیل کو پہنچ جائیں، یہ تسخیرِ علم، ہدایت اور کتابِ مُنیر سے ممکن ہے، روشن کتابِ امامِ زمانؑ کا نور ہے، روحانی ہدایتِ حجت کا درجہ ہے اور علمِ یقین داعیِ کامر ہے، پس اس آیتِ مبارکہ کے بموجب اللہ تعالیٰ کی تمام ظاہری نعمتیں انسانوں کو عالمِ جسمانی کے مسخر ہونے سے حاصل ہیں، اور باطنی نعمتیں اس کی صورتِ باطن سے ملی ہیں جو انسان کے باطن میں ہے، اور یہ سب کچھ کتابِ مُنیر کی بدولت ہے جو مومنین میں امام کی روحانیت و نورانیت اور علیؑ تاویل ہے، جس میں کائنات کی ایک مکمل علمی صورت موجود ہے۔

”علم“ (جاننا) عمل م کے مادہ سے مصدر ہے، عالم، اسم فاعل ہے اور ”عالم“ اسم آلہ ہے، یعنی وہ چیز جس کے ذریعہ ہم زمین جانی پہچانی جاتی ہیں، چنانچہ خدا نے عالم کبیر کو عالم صغیر میں سما دیا، یعنی اُس نے اپنی رحمت سے علم کے آلہ کو ظاہر کو آلہ باطن کے ساتھ ایک کر دیا، اور اسی طرح نہ صرف ”عالمین“ کے معنی کا اطلاق براہ راست انسانوں پر ہوا، بلکہ اس سے یہ حقیقت بھی روشن ہو گئی کہ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور اس معنی میں ہے کہ وہ ساری کائنات کی روحانی صورت کو چشم حقیقت میں رکھ دیتا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ بہشت کا طول و عرض اس مادی کائنات کے برابر ہے (۳۳، ۴۰، ۴۱) اور اہل دانش اس حقیقت پر یقین کر سکتے ہیں کہ جو چیز اس ظاہری کائنات کے بالکل برابر ہے، وہ اس کا بھتیجہ، ابدائیت ہے، جو جنت بھی ہے اور کائنات کا لطیف جسم بھی ہے، اور آسمان و زمین کے ابدائی صورت میں موجود ہونے کا ثبوت اس فرمان الہی میں ہے: **يَدْبِعُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ** وَاِذَا قَضَىٰ اٰمْرًا فَاِنَّهَا يَقُوْلُ لَهَا كُنْ فَيَكُوْنُ (۱۱، ۲) وہی آسمانوں اور زمین کا بدیع اور مبدع ہے اور جب کوئی امر پورا ہوتا ہے تو اسے کُن فرماتا ہے اور وہ ہو جاتا ہے، پس معلوم ہوا کہ کائنات کے لطیف و کثیف دو جسم ہیں، جس طرح قرآن اس حقیقت کی طرف بار بار توجہ دلاتا ہے اور اس بات پر زور دیتا

ہے کہ کوئی چیز بھفت یعنی بوڑھے کے بغیر نہیں، سو کائنات کے ہوں یا انسان کے جسم لطیف و کثیف بطریق ضد بھفت ہیں۔

اس بیان کے بعد کہنا یوں ہے کہ کائنات جہاں جسم لطیف کے اعتبار سے ابداعی شکل میں موجود ہے، وہاں اس میں ہمیشہ کن فوفیکون کے گونا گون ظہورات ہوتے رہتے ہیں، لہذا اس کا سب سے عظیم ظہور انسانِ کامل کی صورت میں ہوتا ہے، جو خدا کی خدائی کے عظیم بھیدوں کا خزانہ ہے، اور یہ وہ مقام ہے جس میں مجملہ کائنات بوجہ ابداع ظاہر موجود ہوتی ہے، جس طرح پیشانی میں ہمتہ جہان بوجہ ابداع باطن موجود ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ابداع ظاہر میں بھی ہے اور باطن میں بھی۔

مذکورہ حقیقت دوسرے لفظوں میں پیش کی جاتی ہے کہ جس طرح عالمِ صغیر ایک ایسے انسان میں محدود ہے کہ وہ ابھی انسانِ کامل نہیں ہوا ہے، اسی اصول کے مطابق عالمِ کبیر کا جسمِ لطیف ایک ایسے انسان کی ہستی میں سمایا ہوا ہے کہ وہ کامل اور مکمل ہے، جیسا کہ فرمودہ خدا ہے: **وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ (۲۵۵)** اس کی کرسی سب آسمانوں اور زمینوں کو گھیرے ہوئے ہے، یعنی انسانِ کامل کا جتہ نورانی جو نفسِ کُلّی سے مل گیا ہے، اللہ کی کرسی ہے، جس میں کائنات کی ابداعی صورت بطریق جسمِ لطیف سما گئی ہے۔

ایک حدیث کے مطابق انسانِ خدا کا راز ہے اور خدا انسان کا

راز ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے عوام سے یہ حقیقت پوشیدہ رکھی ہے کہ انسان اول و آخر میں کیا مرتبہ رکھتا ہے اور رب کریم کا اُس سے کیا رشتہ ہے، یہ بات عوام الناس کے اعتبار سے فرمائی گئی ہے، مگر انبیاء و اولیاء کے توسط سے خدا کے بعض بندے یہ جان چکے ہیں کہ یہ راز کیا ہے، کیونکہ تفاوتِ عمل اور ترقی و پس ماندگی کے سبب سے لوگوں کے مختلف درجات ہو کر تے ہیں۔

انسان روحانی اعتبار سے اس دنیا میں کیسے آیا؟ کیوں آیا؟ کہاں سے آیا؟ اگر مانا جاتے کہ یہ اللہ کے حضور سے یہاں آیا ہے، تو بہت بڑا سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کے قرب کو چھوڑ کر اس دنیا میں کیوں آنا چاہتے؟ ان جیسے بڑے بڑے سوالات اور بھی ہیں، مگر یہ جاننا ضروری ہے کہ رُوح کیا ہے، تاکہ بوقتِ ضرورت سوال صحیح ہو، اور بہت سے سوالات وہیں پر ختم ہو جائیں، چنانچہ اگر کہا جائے کہ رُوح بسیط ہے یعنی ایک ہمہ گیر اور ہمہ رس حقیقت، تو بہت سے سوال ختم ہو جاتے ہیں، اور اگر یہ قبول کر لیا جائے کہ رُوح صورتِ رحمان ہے، جیسے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی رحمانی صورت پر پیدا کیا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ آدم و بنی آدم رحمان کی زندہ تصویریں ہیں، اور حقیقتِ رُوح کے متعلق یہی تصور سب سے بہتر اور قابلِ فہم ہے۔

سورج کی روشنی کائنات میں پھیلتی رہتی ہے مگر یہ ایک طرف

سے سرچینیہ نور شدید سے وابستہ رہتی ہے، اسی طرح رُوح اپنی اصل کے ساتھ
 اتصال رکھتی ہے جیسے درخت سے اس کا سایہ مر لُوط رہتا ہے جس طرح
 کسی دُور ملک سے آپ کو فون آتا ہے، آپ اس مثال میں بھی سوچ سکتے
 ہیں کہ کس طرح ایک ہی بجلی گھر سے کسی شہر کے لاکھوں بلب روشن ہو جاتے
 ہیں، وائر لیس، ریڈیو، فلم اور ٹی وی میں رُوح کے عجائب و غرائب
 کی بہت سی مثالیں موجود ہیں، مگر یہ معلوم نہیں کہ کوئی کس طرح سوچتا ہے۔
 شخصی عالم ایک ایسا جہان ہے، جس میں تصورِ آفرینش کی
 روشن حقیقتیں موجود ہیں، اور اس میں خُدا نے یہ علم بھی رکھا ہوا ہے
 کہ عالمِ دین کس طرح مکمل ہوا، پیغمبر اور امام کی معرفت نور کی شناخت
 سے الگ نہیں، انسان کی رسائی معرفت تک ہے اور پھر کیا چاہئے، رُوح
 مومن اور رُوح قرآن ازل اور ابد میں ایک ہے، انسان کی ذاتی دُنیا کا ذکر
 قرآن پاک کی ہر آیت میں موجود ہے، جبکہ عالمِ کبیر اور عالمِ دین دونوں
 عالمِ شخصی میں سماتے ہوتے ہیں۔

فقط آپ کا علمی خادم
 نصیر الدین نصیر ہونزاتی
 لندن ۲۲ جولائی ۱۹۸۳ء

قرآن حکیم میں لفظِ نعمت

”نعمت“ قرآنِ پاک کے خاص اور پرہکمت الفاظ میں سے ہے، کیونکہ یہ اپنے معنی میں بڑا جامع ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ لفظ اُمّ الکتاب (سورۃ فاتحہ) میں بمقام ”انعمت علیہم“ استعمال فرمایا گیا ہے، جس کے بموجب ”صراطِ مستقیم“ اس لئے قابلِ تعریف ہے کہ وہ ان حضرات کا راستہ ہے، جن کو خداوندِ عالم نے اپنی تمام نعمتوں سے نوازا ہے۔ (۶۹)۔

نعمت کے معنی ہیں عنایت، احسان، خوش حالی اور ہر وہ چیز جس میں لذت و راحت ہو، اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے تین قسم کی نعمتیں بنائی ہیں، اُن میں سب سے اعلیٰ درجہ کی نعمتیں عقلی اور علمی صورت میں ہوا کرتی ہیں، دوسری قسم کی نعمتیں روحانی شکل میں پائی جاتی ہیں اور تیسری قسم کی نعمتیں وہ ہیں جن کا تعلق جسم سے ہے، یعنی مادی اور جسمانی نعمتیں، جو اس دُنیا کے ظاہر میں نظر آتی ہیں۔

نعمتوں کی ایک اور تقسیم بھی ہے، جس کے مطابق وہ ظاہری نعمتیں
 اور باطنی نعمتیں کہلاتی ہیں، جیسے قرآن مقدس کا ارشاد ہے: **وَاسْبِغْ**
عَلَيْكُمْ نِعْمَتَهُ، ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً (۳۱) اور **رُحْدَانِي** تم پر
 اپنی ظاہری و باطنی نعمتیں پوری کر دیں۔ اس سے یہ مطلب صاف
 طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح جسم ظاہر ہے اسی طرح جسمانی
 نعمتیں بھی ظاہر ہیں، اور جس طرح عقل و روح پوشیدہ ہیں، اسی
 طرح عقلی اور روحانی نعمتیں بھی باطن ہیں، اور اس کی منطق یہ بنتی ہے
 کہ قرآن اور اسلام کی تمام تر عقلی اور روحانی نعمتیں تاویلی حکمت میں
 پنہان ہیں، جس کی مثال آپ دُنیا تے ظاہر ہی میں دیکھ سکتے ہیں کہ ہر
 وہ چیز جو جسم کی غذا اور نعمت جسمانی کہلاتی ہے، وہ پوشیدگی سے نکلتی
 ہے یا نکالی جاتی ہے، چنانچہ درخت یعنی پودا زمین سے سر اُبھارتا ہے،
 پھل درخت کے باطن سے پیدا ہوتا ہے، پھل کا وہ حصہ جو کھا یا جاتا
 ہے، پھلکے سے برآمد ہو جاتا ہے، گٹھلی اُس کے باطن میں ہوتی ہے مغز
 گٹھلی میں سے نکالا جاتا ہے اور تیل مغز کے باطن سے نکالا جاتا ہے،
 جو اس سلسلے میں سب سے باطنی چیز ہے، اسی طرح دودھ گائے کے
 باطن سے پیدا ہوتا ہے، مکھن دودھ کے باطن سے، تیل
 مکھن کے باطن سے اور انرجی (ENERGY) تیل کے باطن سے، ان
 مثالوں سے معلوم ہوا کہ اگرچہ جسمانی نعمتیں ظاہر ہیں، تاہم وہ اہل
 دانش کے سامنے بڑی عمدگی سے یہ مثال پیش کرتی ہیں کہ عقل اور

رُوح کی نعمتیں کس طرح باطن ہیں۔

آیہ کریمہ قرآن ربہ کہ میطابق اسلام کی تکمیل اور نعمتِ خداوندی کا اتمام اُس روز ہوگا جبکہ مولا مرتضیٰ علیؑ آنحضرتؐ کے جانشین مقرر ہوئے تھے، اس سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ سلسلہٴ نذرِ دلِ قرآن کا مکمل ہو جانا اولیٰ الامر کے تقرر کا عمل میں آنا اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے، جس سے بڑھ کر اس دُنیا میں کوئی نعمت نہیں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا شدہ نعمتوں کو یاد کرنے کے لئے فرمایا گیا ہے، یہ عمل اگر ایک طرف سے تشکر گزار ہی اور قدر دانی ہے تو دوسری طرف سے اس میں یادِ الٰہی اور مسرت و شادمانی کا ایک عظیم فلسفہ بھی ہے، یقیناً رب کریم کے احسانات کا تذکرہ اپنے دامن مقدس میں خوشیوں کے پھول لا دیتا ہے۔

خداوند تعالیٰ بنی اسرائیل سے فرماتا ہے کہ: اے بنی اسرائیل (یعقوبؑ کی اولاد) میری عطا کردہ نعمت کو یاد کرو (د. ۲۰)۔ اس میں پروردگارِ عالم کے ان تمام احسانات کے معانی لفظ "نعمت" میں سمو گئے ہیں، جو طرح طرح کے معجزات اور علم و حکمت کی صورت میں تھے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ نعمتِ خدا کے ہر اُس احسان کا نام ہے، کہ اس کے بغیر دین میں اللہ کی رحمت کا کوئی ثبوت نہیں مل سکتا ہے۔ دُنیا میں کہیں ماں باپ کے بغیر بھائیوں کا تصور نہیں، چنانچہ پیغمبرِ خدا اور آپ کے وحی مولا علیؑ مومنین کے حق میں نہ صرف خدا

کی رسی تھے بلکہ روحانی ماں باپ بھی تھے، پس یہی سبب ہے کہ قرآن میں جہاں اللہ کی رسی کا ذکر ہے، وہاں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ تم اس کی نعمت سے بھاتی بھاتی ہو گئے (۱۰۳)۔ یہاں نعمت سے روحانی ماں کا دودھ مراد ہے، یعنی تسلیم و ہدایت، جس کی بدولت مومنین رشتہ انوت سے وابستہ ہو گئے۔

قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا ہے: بیشک نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے تختوں پر بیٹھے نظارے کریں گے (۲۲)۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ بہشت کا تخت کیسا ہے، اور جنت والوں کے نظارے کی کیا حدود ہوں گی؟ جو اب عرض ہے کہ وہ تخت بے جان نہیں بلکہ زندہ ہے، جس کی مثال یو۔ ایف۔ او یا جسم لطیف ہے، جس کے ذریعہ وہ پوری کائنات کی سیاحت اور نظارہ کریں گے۔

سورۃ نمل کی آیت ۱۳ تا ۱۹ کا مطالعہ کر کے ہر دانشمند مومن یہ یقین کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کو جو علم و فضل اور جو روحانی سلطنت عطا فرمائی تھی، وہ خداوند مہربان کی عظیم ترین نعمت تھی۔

بہشت کی ان تمام چیزوں کا نام نعمت ہے، جن میں عقل اور نفس مطمئنہ کے لئے گونا گونا گونا گویا نعمتیں بھی ہوتی ہیں، جیسے ارشاد ہے: وَإِذَا رَأَيْتُمْ رَأَيْتُمْ نِعْمًا

وَمَدَّكَ كَبِيرًا (۲۶) اور جب تم وہاں نگاہ اٹھاؤ گے تو ہر طرح کی نعمت اور عظیم اُتار سلطنت دیکھو گے۔ یہ سلطنت جو سب سے عظیم اور لازوال ہے کس کی ہوگی؟ خداوند کی اور اس کے برگزیدہ بندوں کی۔

خدا تے بزرگ و برتر تے جس جس درجہ کے کامل اور برگزیدہ انسانوں کو اپنی نعمتیں عطا فرماتی ہیں، وہ نبیین، صدیقین، شہداء اور صالحین کے علاوہ فرمانبردار مومنین ہیں، اور اگر موضوعِ نعمت کے اس ربط کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ مضمون تمام قرآن میں پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے، اسی طرح لفظِ نعمت قرآن حکیم کے دوسرے بہت سے جامع الفاظ کے ساتھ ملا ہوا نظر آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی پیاری کتاب (قرآن عزیز) عقلی، علمی اور روحانی نعمتوں کے تذکروں سے بھر پور ہے، اور خاص کر سورۃ رحمان جو مولا علی صلوات اللہ علیہ کے مبارک ارشاد کے مطابق عروس القرآن ہے، اس میں عالمِ دین کی اُن جملہ نعمتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے، جو مخلوقِ لطیف و کثیف کے لئے بنائی گئی ہیں، جہاں نعمتوں کا تذکرہ الاء کے نام سے فرمایا گیا ہے۔

سورۃ رحمان میں سب سے پہلے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ خداوند مہربان نے جو کچھ سکھایا ہے، اور جو کچھ بنایا ہے وہ نعمت ہی نعمت ہے، اور اللہ کی ان تمام نعمتوں میں جن و انس دونوں

برابر کے شریک ہیں، اور اس سے لازمی طور پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ جن
 و اس کے درمیان وہ رشتہ کیا ہے جس کی وجہ سے یہاں یہ دونوں
 ہر عظیم نعمت پر ایک دوسرے کے ساتھ ہیں؟ اس کے جواب کے
 لئے یوں عرض کیا جاتا ہے کہ جن درحقیقت انسان کا ایک لطیف
 روپ ہے اور انسان اس کا ایک کثیف روپ، چنانچہ یہ اس کے
 بغیر اور وہ اس کے سوا مکمل نہیں، اور اگر یہاں یہ سوال بھی ہو کہ
 جب جن جو ہر آتش سے اور انسان جو ہر خاک سے پیدا کیا گیا ہے تو یہ
 کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں مخلوق ایک ہوں؟ اس کے لئے جواب
 عرض کرتا ہوں کہ وہ بات عالم دوز سے متعلق ہے، کہ وہاں عناصر کے
 الگ الگ اجزاء اور ذرات تک زندہ ہیں، مگر اس میں کوئی
 مخلوق اس دنیا میں آئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی ہے، چنانچہ انسانی
 جسم اگرچہ بظاہر صرف انسان ہی کے لئے مخصوص لگتا ہے، تاہم
 حقیقت اس کے برعکس ہے کیونکہ انسانی صورت میں سب کچھ جمع
 ہے، جبکہ یہ ایک کائنات ہے، تو اس میں جمادات و نباتات تو
 ترقی اور فنا کی شکل میں ہیں، لیکن اخلاقی اور مذہبی طور پر گرہ لگا ہوا
 آدمی بوجیب قانونِ خداوندی حیوان ہے (۲۵، ۱۷۹) اگر کوئی آدمی
 لوگوں کو گمراہ کر دینے والا ہے تو وہ شیطان ہے (۱۳) اور اگر کوئی
 خدا کا برگزیدہ ہے تو وہ فرشتہ ہے (۱۷، ۹۵)۔

سورۃ رحمان میں جن و اس سے یہ سوال: قِبَايِ الدَّارِ رَبِّكَمَا

تَكَذِّبِينَ (اے گمراہ بین و انس تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو مٹھلاتے ہو، کل ۳۱ مرتبہ کیا گیا ہے، اور ۳۱ حدودِ دین کا عدد ہے، یعنی پانچ حدودِ روحانی، سات صاحبانِ ادوارِ مہین، سات صاحبانِ ادوارِ کہین، اور بارہ حجت (۵ + ۴ + ۳ = ۱۲) پس یہ تمام نعمتیں جن کا پُر حکمت ذکر اس سورہ میں فرمایا گیا ہے عقلی، علمی، عرفانی اور روحانی ہیں، جو حدودِ دین سے متعلق ہیں، یعنی عقلِ کُل، نفسِ کُل، جَد، فِج، خیال، چھ ناطق، حضرت قائم، سات ائمہ (ہر چھوٹے دور کے) اور بارہ حجت۔

انسان خواہ جسمِ خاکی کی نسبت سے بشر کہلاتے یا جسمِ لطیف کے سبب سے جن ہر حالت میں حدودِ دین کی ان نعمتوں کا محتاج ہے، جن کا ذکر عروس القرآن (سورۃ رحمان) میں فرمایا گیا ہے، پس ہر مومن پر فرض ہے کہ وہ نورِ علم کی روشنی میں خود کو پہچان لے اور ان نعمتوں کو بھی پہچان لے، جو قرآن خاص کر سورۃ رحمن میں مذکور ہیں۔

کسی دیندار کو جن کے متعلق بڑے سے بڑے شک میں مبتلا رہتا زبردست عرفانی نقصان کا باعث ہے، لہذا اسے یہ جاننا ضروری ہے کہ جس طرح سب انسان ایک جیسے نہیں ہو سکتے، کیونکہ کچھ تو اچھے ہیں اور کچھ بُرے، بالکل یہی بات جنات میں بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایتِ بے نہایت سے قرآنِ حکیم میں ہر ضروری بات بتا رکھی ہے،

اس دُنیا میں کچھ کیرٹے ایسے بھی ہیں، جو آگے چل کر پروانے تنگے بن جاتے ہیں، پروانے تو لاتعداد ہوا کرتے ہیں، مگر سب کی کوئی اہمیت نہیں، اہمیت اور قدر و قیمت صرف ان پروانوں کی ہوتی ہے جو ریشم کے کیرٹوں سے بن جاتے ہیں، قرآنِ حکیم میں دیکھتے: یَوْمَ یَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْتُوثِ (۱۶۱) جس دن لوگ پروانوں کی طرح پھیلے ہوں گے۔ یعنی سب لوگ ذراتِ لطیف میں ہوں گے، اس آیت میں انسانوں کے کثیف سے لطیف بن جانے کا ذکر ہے، جو پروانے ریشم کے کیرٹوں سے ہیں ان کو بچا لیا جائے گا، یہ صالحین کی مثال ہے۔

نصیر الدین نصیر ہونزائی

لندن: ۱۴ جولائی ۱۹۸۳ء

Knowledge for a united humanity

قرآن حکیم میں لفظ "امین"

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ - لفظ "امین" قرآن حکیم کے اُن پیارے پیارے الفاظ میں سے ہے، جو مغزِ معنی و حکمت سے بھر پور ہیں، امین کا مادہ امن ہے، اور یہی مادہ ایمان کا بھی ہے، امین کے معنی امانت دار، معتبر اور امن والا ہیں۔

گُلّ ۱۴ (چودہ) بار

امین کا لفظ قرآن پاک میں گُلّ ۱۴ بار استعمال فرمایا گیا ہے، یہ لفظ اپنے معنی میں ہر بار ایک پاکیزہ وجود کو پیش کرتا ہے جیسے جبرائیلؑ، رسلؑ، شہرِ مکہؑ وغیرہ، الف میم نون کے اور بھی مشتقات قرآن میں موجود ہیں، سو یہاں (اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰی) سعی کی جاتی ہے کہ ان آیاتِ کریمہ کی پوشیدہ حکمتوں کی طرف توجّہ دلائی جائے جو لفظ امین سے متعلق ہیں۔

ترجمہ آیت کریمہ ہے کہ : یقیناً ہم نے امانت کو سارے آسمان اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے اس (بار) کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اسے اٹھالیا، بیشک انسان (اپنے حق میں) بڑا ظالم (اُو) نادان ہے (۲۶/۳۳) اب سوال اٹھتا ہے کہ یہ امانت کیا تھی؟ آیا یہ اختیار تھا؟ کیا یہ عبادت و معرفت تھی؟ وہ کون سا بار گر ان تھا جس کے اٹھانے سے کائنات نے انکار کیا اور ڈر گئی؟ اور پھر جب انسان نے اسے اٹھالیا تو وہ ظلم و جہول کس سبب سے کہلایا؟ ان شاء اللہ یہ سوالات اس مضمون میں حل ہو سکتے ہیں۔

حضرت نوحؑ امین تھے

آیت مقدسہ کا ترجمہ ہے کہ : نوحؑ کی قوم نے پیغمبروں کو جھٹلایا، جب ان سے ان کے بھائی نوحؑ نے کہا کہ تم لوگ (خدا سے) کیوں نہیں ڈرتے، میں یقیناً تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں، تم خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو (۱۰۵-۱۰۸)، اس بانی تعلیم کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام پہلے رسولِ امین ہیں، یعنی آپ کے پاس لوگوں کی رُو حافی امانتیں تھیں کہ اگر لوگ خوفِ خدا اور تقویٰ اختیار کر کے اپنے پیغمبر کی اطاعت کرتے تو ان کو رُو حانیت کے سارے خزانے مل جاتے۔

رسولوں کے پاس لوگوں کی امانتیں محفوظ ہونے سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ عالم بالا کے ساتھ انسانیت کا کوئی نہ کوئی تعلق رہا ہے، ورنہ امانت کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا، جیسے آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ: **الْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ** (حکمت مومن کی گم گشتہ چیز ہے)، امانت ہونے یا متارے گم شدہ، دونوں میں تعلق پیشین کا تصور ملتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ امین تھے

سورہ قصص (۲۸) رکوع ۳ میں دیکھتے: یہاں حضرت موسیٰؑ حضرت شعیبؑ کی دو بیٹیوں کی بکریوں کو پانی پلاتے ہیں، جن کی مراد دو روحانی اور ذرات لطیف ہیں، اس مقام پر آپؑ کی ذرات ہستی کی تشبیہ مدین کے پانی سے دی گئی ہے، ذراتی ہستی کا مطلب روح حیوانی ہے، اور قرآن حکیم میں اس کی قربانی کی مختلف مثالیں بیان ہوئی ہیں، چنانچہ حضرت یاسینؑ کی قربانی میں اسی کی طرف اشارہ ہے (۲۵)، قربانی سوختنی کے ذکر میں اسی کی حکمت پوشیدہ ہے (۱۸۳)، چار پرندوں کی قربانی میں یہی چیز ہے (۲۶۰) حضرت اسماعیلؑ کا ذنبہ بھی یہی ہے (۱۰۷) وغیرہ۔

حضرت موسیٰؑ کو قوی اور امین (۲۶) کہنے کا مطلب صرف یہی نہیں کہ آپؑ نے ان دو صاحبزادیوں کی بھڑ بکریوں کو پانی پلایا، بلکہ ان کی اصل قربانی اور عظیم نمونہ عمل یہ ہے کہ آپؑ نے اٹھ یا دس

برس تک ذراتِ ارواح کی چھو پانی کی، جس کی مثال قرآن میں موجود ہے۔
 حضرت موسیٰ علیہ السلام رسولِ امین تھے، جس طرح قرآن
 میں ہے: اور ان سے پہلے ہم نے قومِ فِرعون کی آزمائش کی اور
 ان کے پاس ایک عالی قدر پیغمبر (موسیٰؑ) آئے (اور کہا) کہ خدا
 کے بندوں (بنی اسرائیل) کو میرے حوالے کر دو میں (خدا کی طرف
 سے) تمہارا ایک امانتدار پیغمبر ہوں اور خدا کے سامنے سرکشی
 نہ کرو میں تمہارے پاس ایک واضح و روشن دلیل لے کر آیا ہوں (۲۴/۱۴۱)

تمام پیغمبرِ امین تھے

قرآن مجید کا کہنا ہے کہ جس طرح حضرت نوحؑ اپنے زمانے میں امین
 تھے، اسی طرح حضرت ہودؑ (۱۲۵/۷۴) حضرت صالحؑ (۱۲۳/۲۴) حضرت لوطؑ
 (۱۲۲/۷۴) حضرت یوسفؑ (۱۲/۱۱) اور حضرت شعیبؑ بھی (۲۴/۱۴۸) اپنے اپنے
 وقت میں امانتدار تھے، یعنی ان حضرات کے پاس بشرطِ تقویٰ و اطاعتِ علم
 و حکمت اور رُوحوانی دولت کے خزانے امانت رکھے ہوئے تھے۔

رُوحِ الامین

ترجمہ فرمانِ خداوندی: قرآن کو رُوحِ الامین (جبرائیلؑ) لے
 کر آپ کے دل پر نازل ہوا ہے تاکہ آپ ڈرانے والوں کی طرح ڈرائیں
 یہ صاف عربی زبان میں ہے، اور یہ اگلے پیغمبروں کی کتابوں میں بھی

ہے (۱۹۳-۱۹۶) جس طرح انبیائے کرامؑ لوگوں کے حق میں امانتدار اور امانت گزار ہو کر تھے، اسی طرح رُوح الامین پیغمبروں کا امانت گزار تھا، ہاں اس میں بڑا فرق یہ تھا کہ رسولوں نے تقویٰ اور خدا کی اطاعت سے اپنی تمام تر امانتیں حاصل کر لیں، مگر لوگوں نے ایسا کرنے سے انکار کیا۔

قرآن کسی بھی ظاہری اور مادی صورت میں نازل نہیں ہوا، بلکہ اسے امانت گزار رُوح لے کر آپ کے قلب مبارک پر نازل ہوئی، اس رُوح الامین کو جبرائیلؑ (۲/۹۷) رُوح القدس (۱۶/۲) روحاً (۵۲/۲) اور نوراً (۵۲/۵۲) بھی کہا گیا ہے۔

جَنّات میں بھی امین ہیں

قرآن حکیم میں ہے کہ: جنّات میں سے ایک عفتیت (قوی) نے کہا کہ قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں میں تخت آپ کے پاس لے آؤں گا اور میں اس پر قابو رکھتا ہوں اور امین بھی ہوں (۹۷/۲) آپ باور کریں گے کہ قرآن حکیم کی زبان خاص زبانِ حکمت ہوا کرتی ہے، لہذا یہاں جنّ سے مخلوق لطیف مراد ہے، اور وہ حدودِ دین کی ایک عظیم ہستی تھی، چنانچہ حکمتِ قرآن کے مطابق ملکہ سبکاتخت (جستہ ابداع) دودفعہ حاضر کیا گیا تھا۔

جنت امین ہے

ارشادِ خدا یا گیا ہے: بیشک متقی لوگ امن کی جگہ (یعنی) باغوں اور چشموں میں ہوں گے، ریشم کی دیکھی، باریک اور دیکھی (دیز پٹیاں) پہنے ہوئے ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے ایسا ہی ہوگا (کذا اللک ۵۱-۵۲)۔ مقامِ امین کے معنی امن کی جگہ بھی ہیں اور امانت دار جگہ بھی، کیونکہ بہشت دنیا کے باغ کی طرح بے جان اور بے عقل نہیں، اس کی تو اعلیٰ رُوح اور اعلیٰ عقل ہے، یعنی وہ بصورتِ شخصیت ہے، لہذا جنتِ امن کی جگہ بھی ہے اور امانت دار و امانت گزار بھی ہے۔

باغ کا انحصار پانی پر ہوتا ہے، اسی طرح بہشت کے باغوں کا دار و مدار چشموں پر ہے، وہ چشمے وہی ہیں جو بہشت کی حیرت نہیں ہیں، یعنی عقلِ کلّی، نفسِ کلّی، ناطق اور اساس، اصل انسان رُوح ہے اور اس کا جسم بدرجہہ لباس ہے، ریشمی لباس کا ذکر صرف اس لئے نہیں کہ وہ عمدہ اور نرم ہے، بلکہ وہ خلقِ جدیدِ تخلیقِ جدید کا تذکرہ قرآن میں دس جگہ ہے، یعنی جنتِ ابداعیہ کی علامت (SYMBOL) ہے، کیونکہ ریشم ایک ایسی مخلوق کی پیداوار ہے کہ اس میں ابداع کی مثال موجود ہے، اور یہ بھی یاد رہے کہ قرآن حکیم میں جہاں جہاں »کذا اللک« کا لفظ آیا ہے وہاں کوئی بڑا راز موجود ہوتا ہے۔

قلم الہی امین ہے

سورۃ تکویر (۸۱) میں ہے: بیشک یہ (قرآن) ایک معزز رسول (فرشتہ) کا قول (لایا ہوا بیعام) ہے جو بڑا قوی عرش کے مالک کی بارگاہ میں بلند مرتبہ ہے، اس کی اطاعت کی جاتی ہے (اؤ) پھر امانتدار ہے اور تمہارے ساتھی (یعنی آنحضرتؐ) مجنون نہیں ہیں اور انہوں نے ”اس کو“ اُفتی مبین پر دیکھا ہے اور وہ غیب کی باتوں کے ظاہر کرنے میں بخیل نہیں (۱۹-۲۳)

یہاں ظاہری روایت کے مطابق رسول سے مراد جبرائیل کو لیا گیا ہے، لیکن ہمیں فریاد خدی سے سوچنا چاہیے کہ یہاں جبرائیل کا نام نہیں ہے، اگر ہم قلم الہی کو ایک زندہ حقیقت اور سب سے بڑا فرشتہ مانتے ہیں تو یہاں جو صفات بیان کی گئی ہیں، ان کا صحیح اطلاق اس عظیم فرشتے پر ہو سکتا ہے، چنانچہ ہم قبول کرتے ہیں کہ قرآن قلم الہی کا قول ہے وہ بڑا معزز فرشتہ ہے، جو بڑا طاقتور ہے اور صاحب عرش کا انتہائی مقرب ہے، بحکم خدا سب اس کی اطاعت کرتے ہیں اور یقیناً آنحضرتؐ نے ”اُفتی مبین“ (اُفتی مبین ایک خاص اشارہ ہے) کے مقام پر اس کو دیکھا ہے، اؤ قرآن کے نزول کا آغاز قلم قدرت سے ہونے کے باب میں یہ ارشاد نبوی ہے:-

اِنِّیْ اَخَذْتُ الْوَحْیَ عَنْ جِبْرِیْلِ، وَجِبْرِیْلِ
یَاخُذُهٗ عَنْ مِیْکَائِیْلِ، وَمِیْکَائِیْلِ

یاخذہ عن اسرافیل ، و اسرافیل یاخذہ
 عن اللّوح ، واللّوح یاخذہ عن القلم
 میں وحی جبرائیل سے حاصل کرتا ہوں ، جبرائیل اسے میکائیل سے لیتا
 ہے ، میکائیل اسے اسرافیل سے لیتا ہے ، اسرافیل اسے لوح
 سے لیتا ہے ، اور لوح قلم سے لیتی ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ جس
 طرح جبرائیل ، میکائیل اور اسرافیل فرشتے ہیں اسی طرح لوح و قلم
 بھی فرشتے ہیں ، بلکہ لوح تو روح ارواح یعنی نفسِ کل ہے اور قلم
 عقل عقول یعنی عقلِ کل۔

شہر امن (بلدِ امین)

اللہ تبارک و تعالیٰ کا پاک فرمان ہے : وَهَذَا الْبَلَدُ
 الْاَمِينُ (۹۵) اور اس امن والے شہر کی قسم ۔ اس کی تاویلی
 حکمت یہ ہے کہ شہر امن اساس یعنی مولانا علی صلوات اللہ علیہ وسلم
 ہیں ، کہ خدا تعالیٰ نے سورہ تین کے آغاز میں عقلِ کل ، نفسِ کل ، ناطق
 اور اساس کی جس طرح قسم کھاتی ہے ، اس میں اساس شہر امن میں
 اور یہ حکمت اس معنی میں ہے کہ جو شخص مشاہدہ روحانیت کے
 سلسلے میں مرتبہ اساس کی شناخت کو حاصل کر لیتا ہے ، وہ گویا امن

لہ بحوالہ اساس التّائویل ، فصل اوّل

والے شہر میں داخل ہو جاتا ہے، جہاں بحقیقت خاتمہ خدا موجود ہے لہذا اس کو امن ملتا ہے اور اس کو عالم بالا کی امانتیں بھی ملتی ہیں، کیونکہ لفظ امین کے جتنے معنی ہیں وہ اپنی جگہ پر قائم ہیں۔

امن جنگ نہ ہونے یعنی صلح کی صورت کا بھی نام ہے اور امن حصولِ فتح کا نتیجہ بھی ہے، پختنا پختہ یہاں جس امن کا ذکر فرمایا گیا ہے وہ فتح کے نتیجے میں ہے، وہ اس طرح کہ مادتی برہمتی کے عالمِ شخصی میں دنیا بھر کے لوگ بشکلِ ذراتِ لطیف داخل ہو جاتے ہیں، یہ دینِ خدا کی فتح ہے، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے: **اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ ۝ وَاسْتَغْفِرْ لَهُ ۝ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا ۝** (اسے رسولؐ) جب خدا کی مدد آ پہنچے گی اور (روحانی) فتح ہو جائے گی اور آپؐ لوگوں کو دیکھیں گے کہ سب لوگ خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو آپؐ اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرنا اور اسی سے مغفرت کی دعا مانگنا، بیشک وہ تواب ہے۔

نصر یعنی جبرائیلؑ خدا کی طرف سے زندہ اور عملی مدد ہے اور فتح یعنی میکائیلؑ عملی فتح مندی ہے، اس سے پوری دنیا کی روحانی فتح مراد ہے، دینِ خدا انسانِ کامل ہے، جس کی شخصیت میں تمام اہل جہان کی رُوحیں بقولِ اسلام کے طور پر داخل ہو جاتی ہیں، پروردگار کی حمد میں تسبیح کرنا یہ ہے کہ بقدرتِ خدا انسانِ کامل کی جملہ ہستی جو

ذاتی اور بیرونی ذراتِ ارواح سے مملو ہے ربِّ عزّت کی حمد یہ تسبیح سے گونج اُٹھتی ہے، استغفار یہ ہے کہ ایسی فتح تک خود کو پہنچا کر بخشش حاصل کی جاتی ہے اس لئے یہ آخری عملی استغفار ہے تو آب کے معنی یہ ہیں کہ اُس روز عابد و معبود ایک دوسرے کے انتہائی قریب ہو جاتے ہیں۔

خلاصہ بارِ امانت

اس مضمون کے آغاز میں بارِ امانت کا تذکرہ کرتے وقت چند سوالات پیدا ہوتے تھے، اور سب سے پہلے یہ کہ وہ امانت کیا چیز ہے جس کا ذکر قرآن (۳۳/۲۶) میں فرمایا گیا ہے؟ اس بارے میں عرض یہ ہے کہ وہ امانت جس کے اُٹھانے سے کائنات ڈر گئی، اور جس کو آخر کار انسان نے اُٹھایا، وہ ”اختیار“ ہے، کیونکہ انسان میں صرف اختیار ہی ایک ایسی صلاحیت ہے، جسے ایک معین وقت کے بعد لوٹا دیا جاتا ہے، آپ دیکھ سکتے ہیں کہ قرآن حکیم میں جہاں جہاں ”توکل“ کا ذکر آیا ہے، وہاں اختیار کی امانت رفتہ رفتہ اپنے حقیقی وکیل کو واپس کرنے کی بات ہے، ہاں یہ بات درست ہے کہ ایمان کے درجہ کمال پر اختیار کی امانت کا بوجھ بالکل ہلکا ہو جاتا ہے۔

اگر سماوات، ارض اور جبال سے یہ ظاہری کائنات مراد لیں، تو اسے اختیار کا یہ بوجھ اس لئے نہیں اُٹھانا چاہیے کہ

اس میں دیگر صلاحیتیں نہیں ہیں، جیسی عقل، جان وغیرہ، اور اگر سات آسمان سے ناطقان، سات زمین سے اساسان، اور پہاڑوں سے ائمہ مراد لیں، تو انہیں بھی یہ بارِ امانت ذاتی اعتبار سے نہیں اٹھانا چاہیے کیونکہ وہ حضرات مقام توکل پر ہیں، یعنی وہ یہ بوجھ اٹھا کر اس سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ وہ انسان جس نے یہ امانت اپنے ذمہ اٹھالی تھی کیونکر ظلم و جبر ہوں کہلاتا ہے؟ جو اب عرض ہے کہ اگر یہ انسان بحیثیت مجموعی انسان کہلاتے ہیں، تاہم اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ انبیاء و اولیاء اور عوام الناس ایک جیسے ہیں، کیونکہ خداوند تعالیٰ نے اپنے دوستوں کو ظلم و جہالت سے دور رکھا ہے، اور ان کو دنیا سے انسانیّت کے لئے ”امین“ بنایا ہے، تاکہ لوگ اس بارِ امانت کے اٹھانے میں ان حضرات کی مکمل مدد حاصل کریں، وہ اس طرح کہ تمام دینی امور کے اختیار کو انہیں کے سپرد کریں، تاکہ وہ حضرات نورِ ہدایت کے وسیلے سے کمزور انسانوں کے اس بوجھ کو بٹاتیں، لیکن لوگوں کی اکثریت نے کامل انسانوں کو نہیں پہچانا، جو خدا کی طرف سے امین تھے، یہی وجہ ہے کہ کچھ انسان اپنے سہمی میں ظلم کرنے والے اور جاہل قرار پاتے۔

آپ کا علمی خادم
نصیر الدین نصیر ہونزائی
نندن ۳۱ اگست ۱۹۸۳ء

قصہ مریمؑ سے متعلق

۲۰ سوالات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ - حضرت نبی مریم علیہا السلام
 قدس حکیم کی ان عظیم المرتبت، بابرکت، نورانی اور پاکیزہ ہستیوں
 میں سے ہیں، جن کی حیاتِ طیبہ کا تذکرہ بڑے تقدس سے فرمایا گیا
 ہے، یہاں ان کی مثالی زندگی کی کچھ حکمتیں بذریعہ سوال و جواب
 واضح کر دینے کے لئے کوشش کی جاتی ہے، انشاء اللہ تعالیٰ -

سوال ۱: حضرت مریمؑ کے والد بزرگوار کا کیا نام تھا؟
 ان کی والدہ محترمہ کی کیا خصوصیات تھیں؟ مریمؑ کا نام کس
 نے رکھا؟ آپ کے حق میں آپ کی مادرِ مشفقہ نے ربِّ عزت کے
 حضور سے کیا دعا مانگی؟

جواب: نبی مریمؑ کے والد محترم کا اسم گرامی عمران تھا،
 ان کی والدہ محترمہ کا نام حنتہ بنت قاقوذ، آپ کے والدین خدایست
 اور خدا رسیدہ تھے، مریمؑ کا نام ان کی والدہ نے رکھا، اور انہوں

نے نہ صرف بی بی مریمؑ کو بلکہ اُن کی ذریت کو بھی شیطانِ رحیم کی بُرائی سے محفوظ رکھنے کے لئے پروردگار سے دُعا مانگی۔

سوال ۲: شیطانِ رحیم کے لفظی اور تاویلی معنی بتائیے، اُعینڈھا بیک سے کیا مراد ہے؟ انبٹھا نباتا حسناً میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟

جواب: شیطانِ رحیم کے لغوی معنی ہیں پتھر اڑا کرنے والا شیطان اور اس کی تاویل ہے وہ شخص جو مومن کی طرف پتھر جیسے بیجان مسائل پھینک کر اس کی رُوح الایمان کو ہلاک کرنے کی کوشش کرتا ہے اُعینڈھا بیک کے معنی ہیں: میں اس سچی کو تیری پناہ میں دیتی ہوں، یعنی حدودِ دین کی حفاظت میں رکھتی ہوں تاکہ شیطان کی باتیں اس پر اثر انداز نہ ہو سکیں، انبٹھا نباتا حسناً (۳) میں یہ اشارہ حکمت مقصود ہے کہ جس طرح دُنیا کی تباہات گوناگون ہوا کرتی ہیں، یعنی وہ اچھی سے اچھی بھی ہیں اور بُری سے بُری بھی چُنا چُنا خُداوندِ پاک نے مریمؑ کی شخصیتِ بڑی پاکیزہ بنائی، جس طرح کامل انسانوں کی شخصیتیں ہر طرح سے پاک و پاکیزہ بنائی جاتی ہیں۔

سوال ۳: مریم کی کفالت کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے کس نے

مریم کی کفالت کی اور اس کفالت سے کیا مراد ہے؟

جواب: چونکہ مریم بنام خُدا مذہبی خدمت کی خاطر نذرانہ تھیں، ہر چند کہ لڑکی کی یہ نذرِ خلافِ رواج تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے

اسے قبول فرمایا، اور حضرت ذکرؑ یا علیہ السلام امام مستودع نے اس
 بیحی کو اپنی کفالت میں لے لیا، جس سے اخلاقی، دینی اور روحانی پرورش
 مُراد ہے، پس نبی بنی مریمؑ بحکم خدا ایک ایسی پاک ہستی کی تعلیم و تربیت
 کی پیداوار ہیں کہ وہ پیغمبر بھی تھے اور امام بھی، یعنی حضرت ذکرؑ یا علیہ السلام۔
 سوال ۷۷: محراب کے کیا معنی ہوتے ہیں اور قرآن حکیم میں
 اس کی کیا حکمت ہے؟ رزق کی کیا تاویل ہے؟

جواب: محراب کا لفظ حرب سے ہے، حرب جنگ اور لڑائی
 کو کہتے ہیں، اور محراب وہ جگہ ہے جہاں بیٹھ کر دشمن کے خلاف لڑائی
 کی جاتی ہے، اور قرآن پاک میں اس کی تاویل مقام پیشانی ہے کہ
 انبیائے کرام اور اولیائے عظام کی عملی روحانیت اور ذکر و بندگی اسی
 میں ہوتی ہے اور یہی وہ قلعہ خداوندی ہے، جہاں بحقیقت ہر مومن
 کو نہ صرف مکمل پناہ ملتی ہے بلکہ وہ شیطان کے خلاف جنگ بھی کر سکتا
 ہے، رزق کی تاویل روحانی علم ہے۔

سوال ۷۸: قرآن مقدس (۳۶) میں فرمایا گیا ہے کہ خدا
 نے مریمؑ کو برگزیدہ کیا تھا، وہ پاک و پاکیزہ کی گنتی تھیں، اور دنیا
 بھر کی عورتوں سے منتخب ہوتی تھیں، سو مریمؑ کی برگزیدگی، پاکیزگی
 اور انتخاب کی حکمت بیان کیجئے۔

جواب: آیہ کریمہ میں سب سے پہلے برگزیدگی کا ذکر ہے،
 جس کی مُراد یہ ہے کہ مریمؑ کو لوگوں پر فوقیت دے کر روحانی تعلیم و

تربیت اور اسمِ اعظم عنایت کیا گیا، پھر اُن کی رُوخانی اور عقلی پاکیزگی ہوتی، اور پھر اسی عمل کے نتیجے میں زمانہ بھر کی عورتوں سے اس مقصد کے لئے منتخب ہوتیں کہ اُن سے ایک عظیم سنجیدہ پیدا ہوں، اس میں خاندانِ نبوت و امامت کی برگزیدگی اور پاکیزگی سے متعلق مثالی بیان موجود ہے۔

سوال ۷: جب بیت المقدس کے عابدوں کے آپس میں جھگڑا سا ہوا، کیونکہ ہر ایک کی یہ تمنا تھی کہ حضرت مریمؑ کی کفالت کرے، تو یہ طے ہوا کہ وہ لوگ اپنے قلموں کو پانی میں ڈالیں، جس کا قلم پانی کی سطح پر تیرا رہ جاتے، وہی مریمؑ کی کفالت کرے گا، یہاں قلم کے ایسے معجزے کی کیا تاویل ہے؟

جواب: تاویلِ زبان میں قلم عقل کو کہا جاتا ہے، چنانچہ مریمؑ کی کفالت کے بارے میں اُن عابدوں نے جیسی جیسی دلیلیں پیش کیں، اس میں ان کی عقلیں علم کے پانی میں ڈوب کر رہ گئیں، مگر حضرت ذکرِ یاد ہی کی عقل تھی جو علم کی بلندی پر نمایاں ہو گئی۔

سوال ۸: سورۃ آل عمران (۳/۳۵) کے مطابق: "جب فرشتوں

نے (مریمؑ سے) کہا اے مریمؑ خدا تم کو اپنے ایک خاص کلمہ کی خوشخبری دیتا ہے جس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا (اور) دنیا و آخرت میں وجہہ اور مقربین میں سے ہوگا۔" یہاں یہ پوچھنا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کس معنی میں کلمہ ہیں؟ مسیح کی کیا تاویل ہے؟ لفظ

سوال ۹: مطالعہ قرآن سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ انبیاء کرام کی پاکیزہ زندگی سے متعلق جو جو صفات بیان کی گئی ہیں، ان کی پُرکھت ترتیب میں بعض دفعہ لفظ صالحین آخر میں آتا ہے، اس میں کیا راز پوشیدہ ہے؟ جیسا کہ قرآن (۳۵) میں ہے۔

جواب: اس دُنیا میں شروع سے لے کر اب تک لشکرِ شیطان اور لشکرِ رحمان کے درمیان جنگ کا سلسلہ جاری ہے، شیطان کے لشکر میں جتنے لوگ داخل ہیں، اُن میں بعض جسمِ لطیف رکھتے ہیں اور بعض جسمِ کثیف، قرآن حکیم نے لطیف کو سوار اور کثیف کو پیادہ کہا ہے (۱۶۴)، اب خدائی لشکر کے بارے میں سنئے کہ اس میں بھی لطیف و کثیف دونوں قسم کے جسم میں لاتعداد سپاہی موجود ہیں، یہاں لطیف کا نام آسمانی فوج ہے اور کثیف کا نام ارضی فوج (۲۸) پس قرآن میں جہاں لفظ ”صالحین“ مذکورہ انداز میں آیا ہے، تو اس کا اشارہ جسمِ لطیف کی طرف ہے، وہ یہ کہ انبیاء و اولیاء جسمِ لطیف میں صالحین کہلاتے ہیں، اور وہ رحمانی لشکر میں شریک ہیں (۵۸/۲۱)

سوال ۱۰: کبھی ظاہر و باطن دونوں میں اور کبھی صرف باطن میں امامِ زمانہ کے علاوہ حدودِ دین یعنی درجات ہو کر تھے ہیں، اس اعتبار سے حضرت مریم کا کیا درجہ تھا؟ کیا وہ سنجیبرانہ مرتبہ رکھتی تھیں، شاید اس لئے کہ فرشتوں نے اُن سے کلام کیا؟ آیا آپ

درجہ امامت پر فائز ہو چکی تھیں؟ اور اگر نہیں تو پھر ان کا کیا درجہ تھا؟
 جواب: حضرت مریم علیہا السلام نہ تو کوئی پیغمبر تھیں اور نہ ہی

امام، کیونکہ قانونِ حکمت یہی رہا ہے کہ انبیاء و ائمہ رجال میں سے
 ہوں، لہذا نبی بی مریمؑ حجت کا مرتبہ رکھتی تھیں، جبکہ آپ بقول قرآن
 (۵۷) صَدِيقَةٌ تَحِيْنَ صَدِيقَةٍ کا کیا مطلب ہوتا ہے وہ بھی قرآن حکیم میں
 موجود ہے، آپ سورۃ تحریم (۶۶) کی آخری آیت میں دیکھ سکتے
 ہیں، کہ مریم کے باطن میں رُوح القدس رُوحانیت اور علم و حکمت
 کا کام کرتی تھی، اس لئے انہوں نے اپنے عالم شخصی میں اسمائے
 عظام اور کلمات تامات کی شناخت اور تصدیق کی، اور ظاہراً و
 باطناً آسمانی کتب کی بھی علمی اور عرفانی تصدیق کی۔

سوال ۷۱: اگر یہ کلیہ مان لیا جائے کہ نبی بی مریمؑ اپنے وقت
 میں ایک مقرب حجت تھیں، تو پھر اس صورت میں زمانہ ماضی کے
 ہمارے مجتہدوں یا پیروں کی رُوحانی اور علمی مرتبت کو سمجھنے کے لئے
 حضرت مریمؑ سے کیا کیا مثالیں مل سکتی ہیں؟

جواب: ہماری ذہن تاریخ کے عظیم مجتہدوں اور پیروں کی
 اعلیٰ رُوحانیت اور علم و معرفت کی تمام تر مثالیں اس قصہ قرآن
 سے مل سکتی ہیں، جو مریم علیہا السلام سے متعلق ہیں، اور اس قصے
 کا خاص مقصد بھی یہی ہے، کیونکہ قرآن میں ماضی کی جتنی مثالیں ساری
 کی گئی ہیں، اُن کا رُخ مستقبل کی طرف ہے، جیسی کوئی صاف و

شفاف اور شیرین ندی اہل زمانہ کی طرف بہتی ہو، چنانچہ مریم کے آئینہ مثال میں ہم اپنے بزرگانِ دین کی روحانیت کو سمجھ سکتے ہیں، یہ قصہ اس اعتبار سے عظیم حکمتوں کا خزانہ ہے۔

سوال ۱۲: یہ تو مان لیا کہ مریم عظیم مجتوں اور بیروں کی مثال ہیں، لیکن جس طرح بی بی مریم نے ایک عظیم پیغمبر کو جنم دیا ہے، اس کی مثال ہمارے بزرگوں میں کیا ہے؟

جواب: حضرت مریم جس حیثیت میں ایک خاتون تھیں، اس کا یہاں ذکر نہیں ہے، مگر آپ جس معنی میں مجت اور امام کی روحانی بیوی تھیں، اسی کی بات ہے، اور یہی مثال بزرگانِ دین کی بھی ہے، جنہوں نے بی بی مریم کی طرح زمانے کے نور کو عالم شخصی میں اور دنیا دعوت میں جنم دیا، ہاں یہ یہ سچ ہے کہ نور کا ایک پہلو نہیں بلکہ بہت سے پہلو ہیں، اس کا ایک رشتہ نہیں بلکہ بہت سے رشتے ہیں، اور قرآن پاک میں یہی حقیقت مذکور ہے: ”جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اسی طرح پیغمبر کو پہچانتے ہیں“ (۱۳۶)

سوال ۱۳: ترجمہ آیت کریمہ ہے: ”اور ہم نے مریم کے بیٹے

(عیسے) اور ان کی ماں کو (اپنی قدرت کی، نشانی بنائی تھی اور ان دونوں کو ہم نے ایک اُدنی ہموار ٹھہرنے کے قابل چشمہ والی زمین پر جگہ دی“ (۲۳) یہ بلند جگہ (ربوۃ) ٹھہرنے کے قابل (ذاتِ قرار)

اور چشمہ (معین) کیا ہیں ؟

جواب : ذِيَوَجِّ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ (۲۳) اسی بلند

جگہ جہاں بندۂ مومن کے لئے قسار اور علم کا سرچشمہ ہے، وہ عالم شخصیت میں مرتبہ پیشانی ہے، جس میں رُوحِ انسانی کا مرکز ہے، اور جہاں رُوحِ قدسی جلوہ افروز ہو جاتی ہے اور جسے نور کہا جاتا ہے۔

سوال ۱۴: قرآنِ حکیم کا کہنا ہے کہ انسان کی جسمانی تخلیق

کے سات مراحل ہیں: سُلَالَه، نَطْفَه، عَلَقَه، مُضْغَه، عِظَام، لَحْم اور خلقِ آخر (۱۲-۱۳)، اس لحاظ سے آدمی گویا سات مرتبہ پیدا ہوتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ اسی قانونِ فطرت کے مطابق رُوحانی تخلیق و تکمیل کے بھی سات مراحل ہیں، لہذا حضرت مریمؑ نے رُوحانیت کی سات منزلوں پر حضرت عیسیٰؑ کو گویا سات بار جنم دیا، تو کیا یہ مثال درست ہے ؟

جواب : جی ہاں، یہ مثال بالکل درست ہے، کیونکہ عالم

دین جس طرح چھ عظیم المرتبت پیغمبروں اور حضرت قائم (۱۴۶) سے مکمل ہوا ہے، اسی طرح شخصی عالم کی رُوحانیت بھی سات منزلوں سے گزر جانے کے بعد مکمل ہو جاتی ہے، یعنی رُوحانیت حضرت آدمؑ کی مثال سے شروع ہو کر قائم القیامت تک پہنچ جاتی ہے، پس یہ بات صرف حضرت عیسیٰؑ کے لئے خاص نہیں بلکہ

تکمیل نور کا قاعدہ ہی یہی ہے۔

سوال ۱۵: حضرت مریمؑ اگر ایک طرف بیرو حجت کی مثال ہیں تو دوسری طرف آپؑ دنیا بھر کی عورتوں کے لئے مندرجہ ذیل اور روحانی عظمت و بزرگی کا اعلیٰ نمونہ بھی ہیں، کیا آپ اس سلسلے میں کچھ وضاحت کریں گے؟

جواب: جی ہاں، حضرت مریم علیہا السلام کی پر حکمت مثال میں اللہ تعالیٰ نے تمام مردوں اور عورتوں کو روحانی ترقی کی کیسٹ دعاوت دی ہے، کیونکہ آپؑ روحانیت کے اُس مقام پر کھڑی ہیں، جو پیغمبر اور امام کے بعد کا درجہ ہے، جو سب کے لئے مشترک اور ممکن ہے، اور اس نمونہ عمل میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے، کہ کامیاب مومنین و مومنات باطن اور روحانیت میں کس طرح نور امامت کے ساتھ مل جاتے ہیں۔

سوال ۱۶: قرآن حکیم میں فرعون کی بیوی کے نہ صرف مومنہ ہونے کا ذکر ہے، بلکہ ساتھ ہی ساتھ ان کو نبی بی مریم کی قضا میں بھی لایا گیا ہے (۶۶) تو کیا آپ متعلقہ آیت مفسر کی کوئی تاویلی حکمت بیان کر سکیں گے؟

جواب: فرعون کی بیوی کے بارے میں قرآنی ارشاد ہے: اِذْ قَالَتْ رَبِّ اِیْنِ لٰی عِنْدَکَ بَيْتُنَا فِی الْجَنَّةِ (۶۶) جو اب اُس نے دعا کی پروردگار! میرے لئے بہشت میں اپنے نزدیک ہی

ایک گھر بنا دے، یہ دُعا کئی اعلیٰ حکمتوں پر مبنی ہے، ایک تو یہ ہے کہ اس میں دیدارِ خداوندی اور انتہائی قرب و حضور کا تصور ہے اور دوسری حکمت یہ ہے یہ کہ یہاں بہشت کی تخلیق و تعمیر کا ذکر ہے، اس سے ظاہر ہے کہ وہ خالقِ خداوند تعالیٰ اور حجت کو پہچان چکی ہیں، اس لئے ایسی دُعا کرتی ہیں، اور اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ ایسی دُعا نہ کر سکتیں، اگر کوئی ایسی بات کہی جاتی، جو حکمتِ قدسِ ان کے خلاف ہو، تو وہ حصّہ آیت نہ بن سکتی، یا وہ بات نمونہ باطل کے طور پر پیش ہو جاتی، مگر ایسا نہیں ہے، پس معلوم ہوا کہ فرعون کی بیوی اہل معرفت میں سے تھیں۔

سوال ۷۱: سورہ اور آیہ ۱۲ کے ظاہری معنی کے پیش نظر ایسا لگتا ہے کہ بی بی مریمؑ کی جسمانی عقّت و پاکدامنی کی بدولت آپؑ میں خدا کی رُوح پھونک دی گئی تھی، اس بارے میں آپؑ کا کیا خیال ہے؟

جواب: جسمانی عقّت و پاکدامنی اگرچہ اپنی جگہ ضروری ہے، کیونکہ یہ خواتین کی ایک عام صفت ہے، تاہم اس کے نتیجے میں رُوحِ قدسی حاصل نہیں ہو سکتی ہے، رُوحِ القدس یعنی خدا کی رُوح صرف اُدِّ صرف علم و حکمت کی پاکیزہ باتوں میں پوشیدہ ہو کر کانوں کی راہ سے کسی مومن میں داخل ہو سکتی ہے، لہذا کانوں کو غیروں کی آلودہ باتوں سے پاک و محفوظ رکھنا انتہائی ضروری ہے، اور متعلقہ آیہ کریمہ میں جو مثال دی گئی ہے اس کا مشول یہی ہے۔

سوال ۱۸: آپ نے کہا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کا نورانی جنم رُوحانیت کے سات مقامات پر ہوا تھا، کیا آپ اس کی کوئی مثال سمجھا سکتے ہیں؟

جواب: جی ہاں، انشاء اللہ، مثال کے طور پر: "لَا هَبَ لَكَ غُلَامًا زَكِيًّا" (۱۹/۱)، تاکہ تم کو پاک و پاکیزہ لڑکے کا عطا کروں۔ غلامِ زکی کا یہ اشارہ نورِ عیسیٰؑ کے درجہ کمال کی طرف جاتا ہے، نور کو تاویلاً غلام (لڑکا = بچہ) کہنا اس معنی میں بالکل درست ہے کہ مقام رُوحانیت پر نور کے جتنے ظہورات ہیں، اُن میں سے ایک ظہورِ صوتی بھی ہے، جس میں کئی آوازیں کام کرتی ہیں، اور اُن میں ایک خاص آواز ایک بچے کی سی ہے، لفظِ زکی میں حبیم اور رُوح سے بڑھ کر عقل کی پاکیزگی کا ذکر پوشیدہ ہے، یعنی نور کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ عقلی اور علمی طور پر لوگوں کو پاک کرتا ہے، پس اسی بشارت کے مطابق آگے چل کر حضرت عیسیٰؑ کا آخری رُوحانی جنم ہوتا ہے، اور اور رُوحانی منزل کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "فَطَلِحَا وَاشْرَبِي وَقَرِّي عَيْنًا" (۲۴/۱)، یعنی تازہ خرے کھاؤ اور چشمہ کا پانی پیو اور نور کے دیدار سے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاؤ۔ یہاں قرآن سے حکمت اور پانی سے علم مراد ہے، اور قرئی عیناً کا مطلب قَرَّةُ الْعَيْنِ (آنکھ کی ٹھنڈک) ہے، جو نور اور فرزند ہے، جس کا ہر تہہ اعلیٰ دیدار ہوتا ہے۔

سوال ۱۹: قرآنِ پاک میں ہے کہ: "مریم کے بیٹے

عیسے مسیح خدا کے رسول اور اس کے کلمہ تھے جسے خدا نے مریمؑ کی طرف اتقائے کیا تھا، اور خدا کی طرف سے ایک رُوح تھی (۱۱۱) آپ اس کی وضاحت کیجئے کہ کلمہ کیا ہے؟ رُوح کلمہ سے الگ کیوں ہے؟ آیا کلمہ سے کلمات مراد ہو سکتے ہیں؟ اگر ایسا ہوا تو رُوح کا مطلب ارواح بھی ہو سکتا ہے۔

جواب: کلمہ اسمِ اعظم ہے، جو شروع شروع میں ایک ہوا کرتا ہے، جو مریمؑ کو عطا کیا گیا تھا، رُوح سے رُوحِ قدسی مراد ہے، یہاں اس کا ذکر الگ اس لئے ہے کہ یہ نتیجہ خصوصی عبادت کے طور پر بعد میں آتی ہے، آگے چل کر یہی ایک کلمہ کلماتِ تامات اور اسمائے عظام کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اور یہ رُوح بھی اگرچہ واحد ہے تاہم جمع بھی ہے۔

سوال ۲: بنی مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کس رُوحانیت کی راہ پر چل رہے تھے؟ اس راہ کا کیا نام تھا؟ اس کا آغاز کب سے ہوا؟ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت آدمؑ کی رُوحانیت میں کیا فرق تھا؟

جواب: بنی مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ دینِ خدا کی راہ رُوحانیت پر گامزن تھے، اس راہ کا نام صراطِ مستقیم ہے، اس کا آغاز ازل سے ہے، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت آدمؑ کی رُوحانیت ایک ہی ہے، اس میں کوئی فرق نہیں، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ تمام انبیاء و ائمہ علیہم السلام رُوحانیت میں ایک ہیں، اور تمام مومنین سورۃ فاتحہ کی ربانی تعلیم کے مطابق انہی حضرات کی راہ رُوحانیت پر آگے سے آگے

چلنے کے لئے دُعا کرتے رہتے ہیں ، مگر یہ سوال اس بحث سے الگ ہے کہ آیا ہر مومن یہ جانتا ہے کہ وہ :

” اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ - صِرَاطَ
الَّذِينَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ -“

کی اس دُعا میں کہاں تک جانا چاہتا ہے ؟ صراطِ مُستقیم کی منزل مقصود کیا ہے وغیرہ -

آپ کا علمی خادم

نصیر الدین نصیر ہونزائی

لندن : ۱۸ اگست ۱۹۸۳ء

Luminous Science

Knowledge for a united humanity

روحانیت اور موسیقی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ - اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ
 وَاٰلِ مُحَمَّدٍ - اے خالق کون و مکان! اے پروردگار انس و جان!
 یہ ناچار اور انتہائی مفلس بندہ تیری درگاہِ عالیہ سے ہمیشہ کی طرح تائید
 و نصرت کے لئے عاجزانہ دُعا کرتا ہے، کیونکہ تیری نظرِ رحمت، دستگیری
 اور مدد کے بغیر حقیقی اور روحانی علم کا کوئی کام انجام نہیں پاسکتا، خداوند!
 تو دانا و بینا ہے اور تجھ سے کوئی حال پوشیدہ نہیں کہ یہ ذرّہ کَم مقدار
 اور ناپ چیز بدرجہہ انتہا عاجز و ناتوان ہے، یا رب! اپنی رحمتِ بے
 نہایت سے، اس بندہ کھترین کو توفیق اور سمّت عنایت فرما! آمین!!
 سببِ تحریر ہذا یہ ہے کہ کینڈا کے ہمارے ہوشمند و معزز
 شاگردوں میں سے ایک عزیز نے بذریعہ مکھوتب، اس عاجز
 درویش سے روحانیت و موسیقی کے متعلق دو بڑے اہم سوالوں کا
 کاحل طلب کیا ہے، اور انہوں نے پُر امید ہو کر کہا ہے کہ یہ کام
 ضرور کر کے ان کو بھیج دیا جائے، وہ دو سوال درج ذیل ہیں :-

۱- انسانی رُوح پر موسیقی کا کیا اثر پڑتا ہے؟
 ۲- آیا اعلیٰ رُوحانی تجربات کے سلسلے میں موسیقی کا کوئی کارِ منہی یا کسی طرح کی اہمیت ہوا کرتی ہے؟

آپ دیکھتے ہیں کہ یہ دونوں سوال بڑی عقل و دانش سے کئے گئے ہیں کہ ان کی گرفت کا پھیلاؤ عام سطح سے لے کر رُوحانیت کی بلندیوں تک پایا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے وہ عزیز خود بھی سکالر ہیں اور موسیقی سے ان کو نہ صرف دلچسپی ہے بلکہ عملی تعلق بھی ہے، اب بہتر یہ ہوگا کہ عنوان بالا یعنی ”رُوحانیت اور موسیقی“ کے موضوع پر ایک مفصل مقالہ لکھا جائے اور بالآخر اسی کی روشنی میں خلاصے کی صورت میں جواب مہیا کر دیا جائے، انشاء اللہ تعالیٰ۔

اس بات کو جان لینا ضروری ہے کہ قرآن پاک اور دین اسلام کی رُوح سے اس دنیا کی بعض چیزیں حلال ہیں اور بعض حرام، اور کچھ اشیاء ایسی بھی ہیں کہ وہ ایک پہلو سے حلال اور دوسرے پہلو سے حرام ہیں، مثلاً قرآن حکیم میں گمان کی بابت دیکھئے کہ گمان جس کو عربی میں ظن کہا جاتا ہے، یہ اپنے معنی سے متعلق ایک لفظ ہے اور معنوی طور پر نہیں بدلتا، لیکن اس کے موقع استعمال اور دو مختلف رُخ (حلال و حرام) کو دیکھتے تو سہی، کہ یہ کبھی تو باعثِ ثواب ہو جاتا ہے اور کبھی سببِ گناہ بن جاتا ہے، اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ بس یہی کہ گمان سے جس طرح نیکی ہو سکتی ہے اسی طرح بدی بھی ہو سکتی

ہے، چنانچہ حسنِ نطق (نیک گمان) حلال ہے، اور سوءِ نطق (بدگمان) حرام ہے، اور یہی حال بس موسیقی کا بھی ہے، یعنی اگر یہ نیک نیتی سے نیک مقاصد کے حصول کے لئے ہے تو یقیناً حلال ہے، اور اگر اس کے برعکس ہے تو یہ حرام ہے۔

ہم نے اس موسیقی کی بات بتائی جو لوگوں تک پہنچی ہوئی ہے اور ان کے درمیان مستعمل ہے، مگر اس موسیقی کا ابھی کوئی ذکر نہیں ہوا، جو اپنے سرچشمہ اصل و حقیقت میں موجود ہے، ہاں، انشاء اللہ ہم کچھ آگے چل کر کسی قدر تفصیل سے بتائیں گے کہ موسیقی دراصل عجائبِ قدرت اور اسرارِ حکمت میں سے ہے، اور یہ ایک زبردست طاقت ہے جو اصلاً روحانی ارتقا کی غرض سے بنائی گئی ہے، مگر اس دنیا کے ظاہر میں شیطان نے اپنے لشکر کے ذریعے اس کے اکثر حصے پر قبضہ جما رکھا ہے، تاہم یہ دانشمندی نہیں کہ جو رہا سہا مقدس حصہ ہے اس کو بھی شیطان سے منسوب کر کے چھوڑ دیا جاتے، بلکہ مصالحت و حکمت اسی میں ہے کہ ہر حلال و پاک چیز کو شیطان سے چھین کر اسے محروم و مایوس کر دیا جائے۔

قرآنِ عزیز کی کئی حکمت آگین آیات میں ملکتی اور مقدس موسیقی سے متعلق بہت سے لطیف حکیمانہ اشارات موجود ہیں، مگر اس کا نمایاں تذکرہ ان آیاتِ مبارکہ میں ملتا ہے، جو صورِ اسرافیل اور سبحِ داؤدی کے بارے میں ہیں، چنانچہ ہمیں اول حضرت اسرافیلؑ علیہ السلام اور اس

کے تصور کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے، وہ اس طرح ہے کہ خالقِ عظیم اور ربِّ کریم نے موسیقی کو یہ بڑی عزت کیوں عطا کی کہ وہ آج روحانیت میں بھی اور کل قیامت میں بھی اسی سے اپنی قدیم اور لازوال سلطنت کا اعلان کرواتا ہے؟ (۳۳) صورِ اسرافیل کی اتنی زیادہ اہمیت کس وجہ سے ہے کہ جبرائیل^۱ اور میکائیل^۲ سے بھی ایک عظیم تر فرشتہ اس کے لئے مقرر اور منظر ہے؟ اس میں کیا راز ہے، اور کون سی ایسی قیامت نیز قوت پوشیدہ ہے، کہ جس سے وہ تمام لوگ موت کی نیند سے فوراً جاگ اٹھیں گے، جنہیں دنیوی زندگی میں خوابِ غفلت سے دین کی کوئی طاقت نہیں جگا سکتی تھی؟ نیز یہ سوال ہے کہ نظامِ الہی میں قلم اور لوح کے بعد چار مقرب فرشتے ہیں، ان میں سے ایک عظیم فرشتہ کو موسیقی کا موزیکل سردار دیا گیا، اور چار مشہور آسمانی کتابوں میں سے ایک کتاب مقدس نغموں کی صورت میں پیش کی گئی، آخر اس میں کیا حکمت پنہان ہے؟

بہاں تک لفظِ صور یا ناقور کے لغوی اور ظاہری معنی کا تعلق ہے

یہ تو صرف ایک اشارہ ہے، نیز یہ اصل حقیقت پر حجاب کا کام کر رہا ہے، کیونکہ ہر حقیقت کا ایک حجاب ہوا کرتا ہے، یہاں تک کہ خدا خود بھی اپنی ذاتِ اقدس کے لئے حجاب اختیار فرماتا ہے، چنانچہ اس حکمت والے نے نعماتِ ملکوتی کا نام صور یا ناقور رکھا، جس کے لفظی معنی ہیں نرسنگھا، بگل (TRUMPET) لیکن یہاں اس

اور مٹسما میں آسمان زمین کا فرق ہے، اور ایسا ہونا ضروری ہے۔
 اہل دانش اس نکتہ کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ حضرت اسرافیلؑ
 جس کا ایک قدم آبی اور اصطلاحی طنائیل بعد (خدا کی شان ۳۶)
 ہے، اس کو یہ ہرگز زیب نہیں دیتا کہ ایک عام اور معمولی نوعیت
 کا نرسنگھا بجایا کرے، مگر ہاں یہ ایک یقینی حقیقت ہے کہ وہ لاہوتی
 عشق کا فرشتہ ہے، لہذا وہ عشق الہی کا ناقور بجاتا ہے، آپ اندازہ
 کر سکتے ہیں کہ خدائی عشق کی طاقت ظاہر و باطن کی مجملہ طاقتوں پر
 بادشاہ ہے، یہی وہ قدرتِ خدا ہے، جو نہ صرف قیامت کے دن
 مردوں کو زندہ کر سکتی ہے بلکہ آج بھی ایسے بہت سے مردوں کو حقیقی
 حیات عطا کر سکتی ہے، کہ وہ بظاہر زندہ چلتے پھرتے ہیں، مگر ان
 میں اصل روح نہیں۔

فرمایا گیا ہے کہ: العَشْقُ نَارٌ يَحْرِقُ مَا سِوَا اللَّهِ، یعنی
 حقیقی عشق ایک ایسی معجزاتی آگ ہے کہ وہ اگر حاصل ہو تو یادِ خدا کو
 چھوڑ کر باقی تمام چیزوں کو جلا کر بھسّم کر دیتا ہے، سو ہر دیندار شخص کے
 لئے یہ ضروری ہے، کہ وہ اسرافیلؑ سے متعلق دینی حکمتوں کو سمجھے اور
 ٹھنڈے دل سے غور کرے کہ آیا دین کی مقدس روایات میں کچھ ایسی
 پاکیزہ چیزیں بھی ہیں کہ وہ ذرا ذرا صورتِ قیامت کی طرح ہوں اور ان
 میں خداوند برحق کی انتہائی شیرین محبت کا کوئی کرشمہ جھلکتا ہو؟
 اس مادی دنیا میں جو لوگ دعوتِ حق سے انکار کرنے کی آخری

حد میں پہنچ جاتے ہیں تو خداوندِ عالم ان کے بارے میں فرماتا ہے کہ: **صَلُّوا عَلَيَّ فَبِكَلِمَةٍ سَمِعْتُمْ لَهَا قَوْلَ لَئِنْ لَمْ يَنْصُرُوا لِي وَتَوَكَّلْتُمْ عَلَيَّ لَمَّا قَلَيْتُمْ لَوَجَّهْتُ كَأُولَئِكَ فِي الْغَايَةِ** (۱۸) یہ لوگ بہرے گونگے، اندھے ہیں سو یہ اپنی گمراہی سے باز نہیں آسکتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب ایسے بے شمار لوگ مرجاتے ہیں تو اور زیادہ جسے اور بدتر ہو جاتے ہیں، لیکن اس راز میں سیرت ہی سیرت ہے، کہ خدا کے پاس ایک ایسی انتہائی عظیم اور آخری درجے کی طاقت بھی ہے، جس سے نہ صرف بہروں کو سنانے، گونگوں کو گویا کرنے اور اندھوں کو دکھانے کا کام لیا جاسکتا ہے، بلکہ مردوں کو بھی زندہ کیا جاسکتا ہے، اور یہ طاقت صورِ اسرافیلؑ میں نغمہٴ عشق الہی ہے۔

ناقور کا نام قرآن پاک میں صرف ایک مرتبہ آیا ہے، صور کا تذکرہ دس بار فرمایا گیا ہے، اس کے لئے صیغہ کا لفظ بھی ہے، جو اکشد دفعہ تباہ کن تصور پیش کرتا ہے، یعنی ماضی بعید میں جو نافرمان تو ہیں بڑی سخت آواز سے ہلاک کی گئی ہیں، اس میں بھی صورِ اسرافیل کا زبردست معجزہ تھا۔

قرآنِ مقدس کی جن جن آیات مبارکہ میں صورِ روحانیت و قیامت کی معجز جمائی کا ذکر آیا ہے، ان میں دانش مندوں کو غور و فکر کر کے اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ موت کی نیند سوتے ہوئے نفوس میں حیاتِ نو چھونک کر ان کو جگا دینے والی سماوی بانسری واقعی حقیقی عشق کی جہان ہے، یہ بات یقیناً نورِ معرفت کی روشنی میں ہے

کہ ناقور بحقیقت ملکوتی بانسری ہے جس کی آواز جہان بخش آفاق و انفس پر مسلط و محیط ہو جاتی ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:-

اور جب صور پھونکا جائے گا تو جو لوگ آسمان میں ہیں اور جو زمین میں ہیں سب بہوش ہو کر گم پڑیں گے مگر وہ جس کو اللہ چاہے، پھر دوسری دفعہ پھونکا جائے گا تو فوراً سب کھڑے ہو کر دیکھنے لگیں گے (۳۹/۶۸)۔

اب مناسب ہے کہ اس سلسلے میں حضرت داؤد علیہ السلام کا بھی ذکر کر دیا جائے، کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ صورا سرافیلؑ سے الگ نہ تھے، اس لئے کہ یہ انسان کامل کے باطن میں مسلسل بختا رہتا ہے، چنانچہ یہ باور کرنا حقیقت ہے کہ جناب داؤدؑ حضرت اسرافیلؑ کے منظر تھے، یعنی ایک طرف سے تو اسرافیل کے زیر اثر اور دوسری طرف سے لوگوں پر اثر انداز تھے، دوسرے الفاظ میں یوں کہنا بھی صحیح ہے کہ آپ لوگوں کے لئے اسرافیلؑ کی ترجمانی کر دیتے تھے، کیونکہ عوام الناس صورا عشق کے لاهوتی نعمات تو براہ راست سُن ہی نہیں سکتے، وہ اس کان میں روحانی کان از خود پیدا نہیں کر سکتے، اور وہ اس آنکھ میں عین الیقین حاصل نہیں کر سکتے، لہذا رب کریم نے حضرت داؤدؑ کی مثال میں اہل جہان کو یہ حکم دیا کہ دیکھو اگر کوئی شخص خدا کی یاد و محبت سے غافل ہو جانے کے نتیجے پر مردہ

یائیم مُردہ بن چکا ہو، تو اس کے لئے بھی ایک کامیاب علاج ہمیشہ اس
 دُنیا میں موجود ہے، جس کی بدولت اس کو حیاتِ تازہ عطا ہو سکتی ہے۔
 نضال رہے کہ جبرائیلؑ فرشتہٴ تنزیل، میکائیلؑ فرشتہٴ تاویل
 اور اسرافیلؑ فرشتہٴ عشق ہیں، چنانچہ خداوندِ عالم نے اپنے
 پاک عشق کے نور سے انبیاءِ اولیا کے قلوب کو منور فرمایا، اور
 جس طرح ہر معروف پیغمبر میں بموجبِ حکمت ایک مثالی صفت نمایان
 ہوا کرتی ہے، اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام میں ربّانی عشق
 کی صفت نمایان تھی، چونکہ خدائی عشق اصلاً عالمِ لاہوت کی بلندی
 پر ہے، لہذا بطورِ کامل اس کو چھوونا انتہائی مشکل کام ہے، یہی
 سبب تھا کہ حضرت داؤدؑ ہمیشہ مناجات اور گریہ و زاری میں ڈوبے
 رہتے تھے۔

ویسے تو انسان اپنی ہستی میں بے شمار چیزوں کا مجموعہ ہے
 مگر اساسی طور پر اس میں چار بڑی چیزیں ہیں، جن کی ترتیب یہ ہے:
 جسم، رُوح، عقل اور عشق، اور ان کی غذائیں بھی مختلف اور
 الگ الگ ہیں، چنانچہ جسم کی خوراک جسمانی اور مادی ہے،
 رُوح کی غذا روحانی یعنی ذکر و عبادت سے حاصل ہے، عقل کی خوراک
 عقلی یعنی علم و حکمت سے ہے، عشق کی غذا نورِ ہدایت کے عشق و محبت
 سے حاصل ہوتی ہے۔

یہ ایک روشن دلیل ہے کہ جملہ انبیاء علیہم السلام کی راہِ روحانیت

اور طریقی حقیقت ایک ہی ہے اور وہ صراطِ مستقیم ہے، اور ان حضرات پر جو جو روحانی عجائب و معجزات اور معجزات گزر گئے ہیں، وہ ان کی ہدایت اور مثالی پیروی سے پوشیدہ اور ہٹ کر نہیں ہو سکتے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضور کے برحق جانسینوں کی کامل اور حقیقی پیروی میں ہر درجہ کی معرفت کا حصول ہو سکتا ہے اور اسی طرح انبیائے قدس ان کے تمام روحانی معجزات کا مشاہدہ ممکن ہے، اور اگر ایسا نہ ہوتا تو خداوند مہربان تمام اہل ایمان کو قدس ان حکیم میں ایک ایسی شاندار اور پر مغز دعویٰ تعلیم نہ دیتا، جس کا مفہوم و منشا یہ ہے کہ مومنین کو راہِ روحانیت میں نہ صرف پیغمبروں کے نقش قدم پر چلنا ہے، بلکہ ساتھ ہی ساتھ ان پر عطا کی گئی نعمتوں کا مشاہدہ کر کے خدا کی وسیع تر رحمت کا یقین بھی کر لینا ہے، اور وہ بابرکت دعویٰ ہے: **اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (۵-۶)**

آپ شاید باور کریں گے کہ حضرت داؤد سپینہ ظاہر کی نسبت باطن میں کہیں زیادہ خوش الحان تھے، آپ نہ صرف جسمانی زبان سے پروردگار کی حمد و ثنا کے گیت گایا کرتے تھے، بلکہ اپنی رُوح کی انتہائی شیریں اور سُرِیلی آواز میں بھی لاهوتی ترانے لاپتے تھے، جیسا کہ باری تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے :-

اور ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو تابع کر دیا کہ وہ داؤد

کے ساتھ تسبیح کرتے تھے اور ہم ہی میں ایسا کرنے کی قدرت ہے (۲۱/۲۹) مہاروں کی تاویل ہے بڑی بڑی رُوحیں اور پرندوں سے عام رُوحیں مراد ہیں، چنانچہ قیامت نیز معجزاتی بالنسریٰ بجنے پر بڑی اور چھوٹی ارواح سب کی سب لطیف ذرات کی شکل میں حضرت داؤد میں جمع ہو گئیں، اور پھر زبانِ قدسی سے نغمہ داؤدی کی ہمنوائی کرتی رہیں، جس کے ساتھ جبرائیلؑ، میکائیلؑ اور عزرائیلؑ بھی ہم آہنگ ہو جاتے تھے، اور ناقور کی مبارک آواز برسوں تک جاری رہتی ہے، مگر عام میلند سے اس میں خلل پڑتا ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام ناقور کے بہشتی نعمات اور عشقِ الہی سے محو ہو جاتے تھے، تو انہیں ایک طرف سے یہ احساس ہو جاتا تھا کہ پوری کائنات اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ ان کی ذات میں سمٹ کر محو ہو گئی ہے، اور دوسری طرف سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ آپؑ ناقور کی ہم آہنگی میں ارض و سما میں پھیل رہے ہیں، اور یہ دونوں باتیں حقیقت ہیں، کیونکہ کائنات کی رُوحانی تسخیر اسی طرح ہو کر تھی ہے، جیسا کہ فرمانِ خداوندی ہے :-

کیا تم لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے (غرض سب کچھ) خدا ہی نے یقیناً تمہارا تابع کر دیا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دیں (۳۱/۲۰) اس مبارک ارشاد کی وضاحت یوں ہے کہ پروردگارِ عالم نے ہر

پیغمبر اور ہر امام کی ذاتِ بابرکات میں رُوحانی طور پر آسمان و زمین کی تمام چیزوں کو جمع کر رکھا ہے، اور یہ تسخیر کائنات ہے، تاکہ ہر شخص ہادی زمان کی حقیقی قدرمانداری سے اس دولتِ لازوال کو حاصل کر سکے، ورنہ خُدا تعالیٰ کے اس احسانِ بھانے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔

افسوس ہے کہ بعض لوگ عملی معرفت تو درکنار اس کے لفظی معنی کو بھی نہیں سمجھ سکتے ہیں، ورنہ وہ بہت کچھ باور کر سکتے، کہ معرفتِ شناخت ہے ربِّ عزّت کی، اور اس کی بادشاہی کی ہر چیز کی، اس پر کوئی شخص یہ سوال ضرور کرے گا کہ: یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ خُدا اور جملہ خُدا تی کی معرفت پر علمی احاطہ کر لیا جاتے؟ اس کا جواب مشکل نہیں بڑا سادہ ہے کہ یہ عظیم الشان کام خود خُدا ہی کی رحمت سے انجام پاسکتا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ: **المؤمنُ یُنظَرُ بِنُورِ اللہِ**۔ اس کی وضاحت ہے کہ مومن خُدا کو اور اس کی بادشاہی کی ہر چیز کو نورِ الہی کی آنکھ سے دیکھ کر پہچان لیتا ہے۔

یہ نکتہ ہمیشہ کے لئے یاد رکھو کہ دُنیا کی بادشاہی پر اگندہ دُمنشتر ہوا کرتی ہے، مگر خُدا کی پاک خُدا تی اس کے برعکس یگانہ ہوتی ہے، یعنی وہاں تو صرف اور صرف ایک ایسی حقیقت ہے، جس میں تمام حقیقتوں کی یکجائی اور وحدت ہے، بس اسی "یک حقیقت" کی معرفت (پہچان) کل معرفتوں کا سرچشمہ ہے۔

مذکورہ بالا اصل اصول کی روشنی میں آپ یقین کر سکیں گے، کہ قرآن کریم میں جن جن حقائق و معارف کا الگ الگ ذکر فرمایا گیا ہے، وہ سب روحانیت کے مرکزِ اعلیٰ پر یکجا اور جمع ہیں، چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ جو صفت ایک سنمید میں نمایان نظر آتی تھی، وہ دوسرے سب انبیاء میں پوشیدہ تھی، لہذا کسی کو ہرگز یہ خیال نہ ہو کہ اسرافیلؑ کے لاهوتی نعمات صرف جناب داؤدؑ سن لیا کرتے تھے، فرشتوں نے صرف حضرت آدمؑ کو سجدہ کیا، اور اللہ نے صرف حضرت موسیٰؑ سے کلام فرمایا، آپ اس میں اچھی طرح سے سوچ سکتے ہیں، کہ حقیقتِ حال کیا ہے۔

بہشت کئی درجات پر مبنی ہے، جس کی اصل و اساس جُستہ ابداعیہ ہے، سو جنت کی لاتعداد نعمتیں چار قسموں میں ہیں، یعنی جسمِ لطیف کے لئے لطیف جسمانی نعمتیں، رُوح کے لئے ہر قسم کی روحانی نعمتیں، عقل کے لئے عقل و دانش اور علم و عرفان کی بیشمار نعمتیں، اور عشق کیلئے رب العزت کی مبارک لقا اور اس کی پاک محبت و عشق کی نعمتیں، چنانچہ بہشت میں خداوند برحق کی تحمید و تجلیل کے نعموں کا ہونا لازمی ہے، اور یہ نعمے ہزار گونہ تجلیات و ظہورات کے مطابق بھی ہوں گے۔

علمائے ظاہر میں سے بعض حضرات بہشت کے نعمات کی دلیل اس آیت کریمہ سے لیتے ہیں: **أَدْخُلُوا الْجَنَّةَ أَنْتُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُونَ** (۲۳) تم اور تمہارے جوڑے جنت میں داخل ہو جاؤ جہاں تمہیں نعمے سناتے جائیں گے ان علماء کا یہ ترجمہ بالکل درست

ہے، اس کے علاوہ اور بھی آیاتِ مبارکہ ہیں، جن کے اندر یہ مطلب پوشیدہ ہے، مثال کے طور پر آپ اس ارشادِ قرآنی میں ذرا غور کریں :-

وَفِيهَا مَا شَتَّهِيدَهُ الْاَنفُسُ وَتَلَاذِبُ الدَّاعِيْنَ (۲۴)

اور وہاں جس چیز کو جی چاہے اور جس سے آنکھیں لذت اٹھاتیں (سب) موجود ہیں۔ حقیقت ظاہر ہے کہ جنت میں ہر وہ چیز موجود ہے جس کو انسان چاہتا ہے، پس اسی سلسلے میں موسیقی اور راگ بھی ہوگا، کیونکہ نفوسِ انسانی ایسی چیزوں کو بھی چاہتے ہیں۔

روحانیت اور موسیقی کی اس بحث میں جہاں سیدنا داؤد کا ذکر جمیل آیا ہے وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ آپ کی آسمانی کتاب زبور سے بھی کوئی مثال پیش کی جائے، چنانچہ زبور کے آخری باب کی چند آیتیں یہ ہیں: نرسنگے کی آواز کے ساتھ اس کی حمد کرو۔ بربط اور ستار پر اس کی حمد کرو۔ دف بجاتے اور تاپتے ہوئے اس کی حمد کرو۔ تار دار سازوں اور بانسلی کے ساتھ اس کی حمد کرو۔ زور سے جھنجھناتی جھانجھ کے ساتھ اس کی حمد کرو (زبور۔ باب ۱۵۰)

اب آخر میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پیغمبرِ آخر زمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم موسیقی اور راگ کو کس نظر سے دیکھتے تھے؟ اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پسند و ناپسند منشاءِ قدرتِ ان کے مطابق ہی ہو سکتی ہے، تاہم اگر کسی عزیز کو اس مسئلہ کی تفصیلات درکار ہوں، تو کتابِ اسلام اور

موسیقی، کا مطالعہ کیا جاتے، جو مولانا شاہ محمد جعفر پھلواری کی ایک عمدہ تصنیف ہے، جسے ”ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ لاہور“ نے شائع کیا ہے۔

مذکورہ کتاب (طبع دوم) کے صفحہ ۲۰ پر یوں درج ہے: اور یہ روایت سب ہی جانتے ہیں کہ ہجرتِ مدینہ کے دن عورتیں دف پر یہ گارہ ہی تھیں :-

طلح البدر علینا من ثنایات الوداع

وداع کے ٹیلوں سے

ما داعا للہ د ا ع

جب تک کہ دعا کر نیوالا دعا کرتا رہے

جئت بالامر المطاع

آپ تو وہ دین لائے ہیں جو خواہ الاطاعت ہے۔

میرے خیال میں یہاں تک جو حقائق و معارف بیان ہوئے، یہ

ان دونوں سوالوں پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہیں، جو اس

مقالہ کے شروع میں درج ہیں، اور خلاصہ یہ ہے کہ انسانی روح

بہاں نقشِ ازل میں ایک زندہ نورِ انیت رکھتی ہے، وہاں یہ

یہ بدرتجہ اعلیٰ لطیف اور ہر گونہ جمال و کمال کی دولت سے مالا مال

ہے، لیکن بہاں اس کی وابستگی جسمِ کثیف سے ہے، وہاں یہ اپنی

تمام تر خوبیاں اور لطافتیں کھو بیٹھی ہے، اور اس کی وہ قدر آتی

اشارات کے مطابق قساوتِ قلبی (دل کی سختی) ہے، جو اخلاقی اور روحانی ترقی کے لئے بنیادی رکاوٹ ہے، اور اس کا علاج ایسی موسیقی اور نغمے میں ہے جو خدا تعالیٰ اور آخرت کی طرف توجہ دلا سکے، تاکہ اس کے نتیجے میں دل میں رحمتِ خداوندی کا معجزہ اپنا کام شروع کرے، اور وہاں جو روح کے مُردہ، نیم مُردہ اور خوابیدہ ذرات ہیں، وہ اس اسرافیلی اور داؤدی اثر سے جاگ اٹھیں۔

اس سے صاف صاف ظاہر ہے کہ انسانی رُوح پر موسیقی کا تعمیری اثر پڑتا ہے، اور اس کی مثال نہ صرف ظاہر میں بلکہ اعلیٰ رُوحانیت میں بھی سُرُج کی طرح ہے، کہ آفتاب اپنی حرارت سے پانی کو کثیف سے لطیف بنا دیتا ہے، جس کی بدولت پانی بلندیوں کی طرف پرواز کر سکتا ہے، یہاں نورِ عیشِ سُرُج ہے اور رُوحِ یخ بستہ پانی۔ وَ بِاللّٰهِ التَّوْفِیْقُ۔

خانہٴ حکمت - کراچی

۲۰ نومبر ۱۹۸۲ء

مذہب اور سائنس

دکراما کا تبیین

مجھے کامل یقین ہے کہ ”مذہب اور سائنس“ کا موضوع عصرِ حاضر میں از بس ضروری ہے، اس لئے میں پُر امید ہوں کہ عنوانِ بالا کے تحت یہاں جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ ہمارے قارئینِ کرام کو مفید ثابت ہو سکتا ہے، کیونکہ سائنس جو قانونِ فطرت کے بھیدوں میں سے ہے اسے کوئی دانشمند دیندار نظر انداز نہیں کر سکتا ہے، بلکہ حقیقت میں ہمیشہ اس بات کی ضرورت رہی ہے کہ مذہب کو سائنس کی روشنی میں دیکھا اور سمجھ لیا جائے، تاکہ اسلام جو دینِ فطرت ہے اس کے باطنی پہلو کو سمجھنے میں مدد ملے۔

مذہب اور سائنس کے متعلق بہت سے موضوعات زیرِ بحث آسکتے ہیں، آج ہم یہاں اس سلسلے میں ”دکراما کا تبیین“ کے عنوان سے کچھ حقائق و معارف بیان کرنا چاہتے ہیں، جن کے بارے

میں سداً ان پاک کا ارشاد ہے کہ :-
 وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ - كِرَامًا كَاتِبِينَ - يَعْلَمُونَ
 مَا تَفْعَلُونَ (۱۰-۱۲) اور تم پر (تمہارے سب اعمال) یاد کرنے
 والے معزز لکھنے والے (فرشتے) مقرر ہیں جو تمہارے سب
 اعمال کو جانتے ہیں -

یہ اصول ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یاد رہے کہ آسمانی کتاب کے ظاہری معنی
 اُس زمانے کے مطابق ہوتے ہیں جس میں کہ کتاب نازل ہوتی تھی، مگر
 اس کی باطنی حکمت (تاویل) آنے والے تمام زمانوں پر محیط ہوتی ہے،
 تاکہ مستقبل کی نئی نسلیں جدید علوم و فنون کی روشنی میں دین کی حقیقتوں
 کو سمجھ سکیں، چنانچہ جو معزز فرشتے انسانی اعمال کے لئے حافظین اور
 کاتبین کا کام کرتے ہیں، ان کی وضاحت موجودہ سائنسی روشنی میں
 درست ہے، کہ یہ فرشتے معزز اس معنی میں ہیں کہ ان کو قادر مطلق
 نے زبردست روحانی طاقتیں عطا کر دی ہیں، اس لئے وہ ہمارے
 اعمال کے زندہ ریکارڈر ہیں، یعنی وہ ہماری پوری زندگی کی روحانی
 فلم اُتارتے رہتے ہیں جس میں اعمال نیک و بد کا ذرہ ذرہ سامنے آتا
 ہے اور کوئی چیز اس سے باہر نہیں رہ سکتی، یہ سب کچھ ان فرشتوں
 کے تحت آٹومیٹک سسٹم سے ہوتا رہتا ہے، اور یہ عظیم باکرامت
 فرشتے جبرائیل، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل علیہم السلام ہیں،
 جن کے زیر فرمان اتنے زیادہ فرشتے اور ارواح کام میں مصروف

ہیں کہ ان کی تعداد اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

انہی ریکارڈ کرنے والے فرشتوں کو رُسل یعنی ایلیٰ یا بھیجے ہوئے بھی کہا گیا ہے (۱۶، ۴۳) کیونکہ جبرائیل، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل علیہم السلام فرشتوں میں سے رسول ہیں، جبکہ خداوند تعالیٰ فرشتوں سے اور انسانوں سے رُسل منتخب کرتا ہے (۲۲) کیونکہ انسان کی ہستی کے دو پہلو ہیں ایک ظاہر ہے اور دوسرا باطن بنا برین آدمی ناسوت اور ملکوت کے درمیان رہتا ہے اور یہی سبب ہے کہ خدا نے ناسوت سے بھی اور ملکوت سے بھی رسول مقرر کئے ہیں۔

پروردگار عالم نے کراما کا تبین کے کام کو اپنی ذات پاک سے منسوب کر کے فرمایا ہے: سَنَكْتُبُ مَا قَالُوا (ہم ان کے کہے ہوئے کو لکھ رہے ہیں ۱۸۱) كَلَّا ط سَنَكْتُبُ مَا يَقُولُ (ہرگز نہیں، ہم اس کا کہا ہوا لکھ لیتے ہیں ۱۹) وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ (اور ہم لکھتے جاتے ہیں وہ اعمال بھی جن کو لوگ آگے بھیجے جاتے ہیں اور ان کے وہ اعمال بھی جن کو سچھے چھوڑ جاتے ہیں ۳۶) اس سے یہ حقیقت عیان ہے کہ جو کام یہ عظیم فرشتے کرتے ہیں وہ گویا خدا بذاتِ خود کرتا ہے۔

کراما کا تبین کی نگرانی میں جو کچھ خود بخود ریکارڈ ہوتا رہتا ہے، اس کا نام اعمال نامہ ہے جو ایک زندہ اور بولنے والی کتاب ہے،

جس سے انسان کی تمام زندگی کی رُو حافی قلم مراد ہے، کیونکہ نامہ اعمال وہ ہے جس میں مکمل گواہی کے طور پر ہر چیز جیسی تھی ویسی درج ہوتی ہے، یعنی انسان اور اس کے قول و فعل کی زندہ اور محرک تصویر ساتھ ہی ساتھ زمان و مکان اور پورے ماحول کا رُو حافی عکس موجود ہوتا ہے، جس کو زمانے کی زبان میں رُو حافی قلم کہنا مناسب ہے، جیسا کہ قرآن حکیم کا ارشاد ہے :-

إِنَّا لَنَحْنُ الْعَاقِلُونَ وَالْمَوْتَىٰ وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ
 وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ (۳۶) بَشِيكْ هَسَم
 مردوں کو زندہ کرتے ہیں اور ہم لکھتے جاتے ہیں وہ اعمال بھی جن کو لوگ آگے بھیجتے جاتے ہیں اور ان کے وہ اعمال بھی جن کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں اور ہم نے ہر چیز کو امام مُبین (کے نور) میں گھیر کر رکھا ہے۔ یہاں اعمال نامہ کے باب میں یہ فہرہ مایا گیا ہے کہ اس میں نہ صرف وہ اعمال و احوال درج ہوتے ہیں جو مرنے سے پہلے آگے بھیجے گئے ہیں بلکہ اس میں وہ آثار بھی ضبط ہیں جو دنیا میں چھوڑ جاتے ہیں اور یہ سب کچھ امام مُبین کے نور میں محدود اور موجود ہے۔ اس سے کئی حکمتیں واضح ہو جاتی ہیں، ایک تو یہ کہ آئینہ اعمال (یعنی اعمال نامہ) میں دو قسم کے احوال نظر آئیں گے، وہ اعمال بھی جو مرنے سے پہلے انجام دیتے گئے تھے، اور وہ آثار بھی جو دنیا میں چھوڑ گئے ہیں، دوسری حکمت یہ ہے کہ

کرنا کا تبیین توہر امامت کی کرتوں کی حیثیت سے ہیں، یہی وجہ ہے جو یہاں
فسر مایا گیا ہے کہ انسانوں کے اعمال و آثار اور ہر چیز امام مبین کے نور
میں مندرج ہوتی ہے، تیسری حکمت یہ ہے کہ اعمال نامہ بولنے والی
کتاب اور امام مبین ایک ہی حقیقت کے مختلف نام ہیں اور وہ حقیقت
امام زمان ہی ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ: **وَلَدَيْنَا كِتَابٌ يَنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ**
(۲۳۳) اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو سچ سچ بولتی ہے اور ان پر کوئی
ظلم نہیں ہوگا۔ یہ بولنے والی کتاب جو خدا کے پاس ہے نور امامت ہے
جو انسانوں کے لئے نامہ اعمال کی حیثیت بھی رکھتا ہے، وہ عزت و
برتری کے معنی میں خدا کے پاس ہے مگر لوگوں کی ہدایت کے لئے دنیا
میں ظاہر ہے تاکہ عدل خداوندی کا جو قانون ہے اس کا تقاضا پورا
ہو، ورنہ یہ بات رحمت ایزدی سے بعید ہے کہ بولنے والی کتاب صرف
خدا ہی کے پاس رہے اور وہ فقط قیامت کے دن انسان پر ظاہر
اس لئے ہو جائے تاکہ شہادت اور حساب میں کوئی شے فرو گذاشت
نہ ہو، یہ تصور درست نہیں، کیونکہ مذکورہ بالا آیت میں ”لَا يُظْلَمُونَ“
فرما کر اس حقیقت کی وضاحت کی گئی ہے کہ بولنے والی کتاب نہ
صرف قیامت میں ظاہر ہوگی بلکہ وہ دنیا میں بھی موجود ہے، اور
اگر ایسا نہ ہوتا تو نعوذ باللہ، خدا کی طرف سے لوگوں پر ظلم ہوتا۔
اعمال نامہ جسے عظیم فرشتے ریکارڈ کرتے ہیں، جس کو

نورِ امامت سے رُوحِ بلیتی ہے ، وہ ذراتِ رُوحِ پُرشکل ہے، چنانچہ انفرادی قیامت یا رُوحانیت میں مشاہدہ کیا گیا ہے کہ یہ اعمال نامہ اُڑتے ہوئے رُوحانی ذرات کی شکل میں آتا ہے ، جیسا کہ فرمانِ الہی ہے :-

اور ہم نے ہر انسان کا اعمال نامہ اس کے گلے میں لگا رکھا ہے اور قیامت کے دن ہم اس کے لئے نکال دیں گے جو اس کو پکھری ہوئی کتاب کی شکل میں ملے گا (۱۱۱) یعنی ہر شخص کا اعمال نامہ اس کے امام سے وابستہ ہے جو رُوحانی گردن کی حیثیت رکھتا ہے اور قیامت کے دن یہ اعمال نامہ منتشر رُوحانی ذرات پر مبنی ملے گا ، اس بارے میں عوام کا خیال ہے کہ اعمال نامہ دُنیا کی ایک کتاب کی طرح ہے اور وہ ورق ورق ہو کر انسان کے پاس آتے گا ، حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے ، اور درست یہ ہے کہ وہ ذراتِ رُوحِ پُرشکل ہے ، لہذا وہ (اعمال نامہ) بولتا ہے۔ جو بندہ مومن جسمانی طور پر مرنے سے پہلے نفسانی طور پر مر کر احوالِ قیامت کا مشاہدہ کرتا ہے ، وہ اس حقیقت پر یقین کرتا ہے کہ ذاتی رُوحانیت ہی اس کا اعمال نامہ ہے ، کیونکہ اعمال کی کتاب کا مقصد اچھے اور بُرے کاموں کے نتائج کو سامنے رکھنا ہے اور رُوحانی مشاہدے یا رُوحانیت کا مطلب باطنی صلاحیتوں سے فائدہ اُٹھا کر نتائجِ اعمال کے متعلق مطمئن ہو جانا ہے۔

ہم اس سے قبل یہ بیان کر چکے ہیں کہ بزرگ فرشتوں کا نامہ اعمال

تیار کرنا دُنیاوی قلم سے نہیں ہے بلکہ وہ رُوحانی قوتوں کے ذریعہ ہے، جس کو ہم اہم جھل کی سائنسی ترقی سے فائدہ اٹھا کر فلمانے سے تشبیہ لے سکتے ہیں، جس طرح ہم سوتے سوتے خواب کی دُنیا کو دیکھتے ہیں، جس میں اچھے اور بُرے بہت سے احوال ہوتے ہیں، جو اعمال نامہ اور رُوحانیت کے ادنیٰ سے نمونے ہوتے ہیں، خواب اور خیال کو ہم فرشتوں کی تحریر تو کہہ سکتے ہیں، مگر یہ مادی قلم کی تحریر نہیں ہے۔ خواب و خیال ہو یا نامہ اعمال و رُوحانیت اس میں اقوال و افعال کو جبرائیل فرشتہ شکل و صورت دیتا ہے، میکائیل رنگ و روشنی بھرتا ہے، اسرافیل ان رُوحانی تصویروں میں رُوحِ ناطقہ ڈالتا ہے اور عزرائیل ان میں تصرف کرتا ہے، یہ ہوا کراماتیں کا نامہ اعمال کو لکھنا اور یہی ہے رُوحانیت کی تحریر۔

یہی رُوحانی تحریر خدائی تحریر ہے، جس میں آسمانی کتاب نازل ہوتی ہے اور تاویل حکمت بھی اسی صورت میں پوشیدہ رہتی ہے چنانچہ مومنین کے لئے یہ امر ممکن ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تنزیل اور امام کی تاویل کا رُوحانی مشاہدہ کر کے ان کے مرتبہ عالی کی معرفت حاصل کریں۔

جاننے کی ضرورت ہے کہ کراماتیں اعمال کے فرشتے ہونے کے علاوہ رحمت کے فرشتے بھی ہیں، وہ یہ کہ عزرائیل انسان کو سلاتا ہے، اسرافیل جگاتا ہے، میکائیل فہم و فراست دیتا ہے

اور جب رائیل فکر و خیال کو پیدا کرتا ہے۔ پس ”کراما“ کے معنی میں
یہ فرشتے معزز بھی ہیں اور کرم والے بھی ہیں۔

فقط آپ کا
علمی خادم
نصیر الدین نصیر ہونزائی
۱۵ اکتوبر ۱۹۸۰ء

Institute for
Spiritual Wisdom
and
Luminous Science

Knowledge for a united humanity

رُوح۔ ایک انتہائی پیاری حقیقت

قرآن پاک اور دینِ اسلام کا مقصدِ عالی یہ ہے کہ مسلمانوں میں پیغمبرِ خداؐ اور امامِ برحقؑ کی تعلیمات و ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اپنے آپ میں چشمِ بصیرت پیدا کر لیں، تاکہ وہ بطریقِ مشاہدہٴ رُوح و روحانیت ربِّ العزت کی معرفت حاصل کر سکیں، اور ان کا ہر قول و عمل دیدہ و دانستہ طور پر انجام پاتے، کیونکہ انسان کو حیوان پر تفوق و برتری اس لئے حاصل ہے کہ یہ ہر بات اور ہر کام عقل و دانش کی روشنی میں کرتا ہے، مگر حیوان اس سے محروم ہے۔

چشمِ بصیرت، دیدہٴ دل اور چشمِ باطن کا مطلب ایک ہی ہے، اور اس کی اہمیت و ضرورت کے بارے میں قرآنِ عزیز کا یہ ارشاد ہے: **قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي (۱۰۸)**، (اے رسولؐ) اُن سے کہہ دو کہ میرا طریقہ تو یہ ہے کہ میں (لوگوں) کو خدا کی طرف بلا تا ہوں میں اور میرا پیرو (یعنی برحق جانشین)، بصیرت پر ہیں یعنی، سہم

حقائق و معارف کو چشمِ باطن سے دیکھتے ہوئے دعوت کرتے ہیں، اس آیتِ کریمہ میں ”مَنْ“ کی ضمیر واحد کے لئے بھی ہے اور جمع کے لئے بھی، سو جہاں واحد ہے وہاں یہ مولا علیؑ کے لئے ہے اور جس طرح جمع بھی ہے اس طرح یہ ائمہؑ، اولادِ علیؑ کے لئے بھی ہے کہ رسولِ پاکؐ کی حقیقی پیروی کا وسیلہ یہی حضرات ہیں اور بصیرت و نور بھی اسی سلسلہٴ مقدس سے وابستہ ہے۔

ہر مسلمان اور ہر مومن میں چشمِ بصیرت کا پیدا ہو جانا انتہائی ضروری ہے، کیونکہ خداوندِ عالم اپنی کتابِ عزیز کے بہت سے ارشادات میں یہ چاہتا ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ آیاتِ قدرت کا مطالعہ کرے، ایسے تمام مقامات پر سب سے اول دیدہ دل کی اہمیت و افادیت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ آیاتِ قدرت میں غور و فکر کا بنیادی تعلق چشمِ بصیرت سے ہے، اور اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔

آیاتِ خداوندی (قدرت کی نشانیاں) تین مختلف مقامات پر ہونے کے باوجود باہم مربوط و منظم ہیں، سب سے پہلے اور سب سے اعلیٰ کتابِ سماوی یعنی قرآنِ کریم ہے جو اللہ تعالیٰ کی بے مثال کتاب ہے، جس کی قدرتی تشریح ایک تو کائنات ہے اور دوسری رُوح، اور رُوح سے انسان کی پاک اور حقیقی رُوح مراد ہے۔

قرآنی غور و فکر اور چشمِ بصیرت کی جیسی اہمیت ہے، اس

سے کوئی دانشمند انکار نہیں کر سکتا، لہذا اس کے ثبوت میں منجملہ ایک آیت کریمہ کا ترجمہ یہ ہے: تو کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا (ان کے) دلوں پر تالے (لگے ہوئے) ہیں (۴۴/۷۴)۔

کائنات میں جو قرآن کی تشریحی آیات ہیں، اُن کے مطالعے کے لئے بصیرت کی جیسی ضرورت ہے، وہ اس قرآنی ہدایت سے ظاہر ہے: یقیناً رات دن کے اُلٹ پھیر میں اور جو کچھ خدا نے آسمانوں اور زمین میں بنایا ہے (اس میں) بے گہیز گاروں کے واسطے بہت سی آیات (نشانیوں) ہیں (۴/۶)۔

انسان کی رُوح و رُوحانیت میں جس طرح آیاتِ قدرت یعنی عجائبات و غرائب یا کہ عظیم معجزات ہیں، ان کے مشاہدے کے لئے دیدہ دل کی جس قدر ضرورت ہے، اس کی بابت فرمانِ الہی کا ترجمہ یہ ہے: اور اہل یقین کے لئے زمین میں (قدرتِ خدا کی) بہت سی نشانیاں ہیں اور خود تم میں بھی ہیں تو تم کیا دیکھتے نہیں (۲۰-۲۱)۔

مندرجہ بالا حقائق سے انسانی غور و فکر اور بصیرت کی بڑی حد تک کمی اور دوسری طرف دائرۂ فہمائش کی بے پناہ وسعتوں کا اندازہ ہو جاتا ہے، اس لئے ظاہری طور پر انسان کی کمزوری اور مستی کی یوں ترجمانی ہو سکتی ہے: انسان ضعیف البنیان کی کیا مجال ہے کہ وہ بیک وقت تین سمندروں میں کود کر موتیوں

کے لئے غواصی کرے، یعنی ایک ہی وقت میں قدر آن جیسے علم و حکمت کے بحرِ عمیق کی گہرائیوں میں بھی اتر جاتے، ساتھ ہی ساتھ کائنات و موجودات کی چیزوں میں بھی فکر دوڑاتے، اور اسی وقت اپنی رُوح یا ذات کے اسرار کی نقاب کشائی بھی کرے، اور اگر یہ لانا تھا کام اُسے باری باری اور جُدا جُدا اوقات میں کرنا ہے، تو پھر بھی اس کی ایک عمر کیا چیز ہو سکتی ہے ہزاروں عمریں بھی ناکافی ہیں! لیکن کسی آدمی کا یہ خیال بالکل غلط ہے، کیونکہ خُدا جو رحمان و رحیم ہے، وہ کسی بھی ناممکن کام کا حکم ہرگز نہیں دیتا، جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے:

لَا يَكْفِيكَ اللَّهُ نَفْسًا، إِلَّا وَسَّعَهَا (۲۸۶) خُدا کسی کو (کسی فریضہ میں)، اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

اس مختصر اور پر حکمت آیت کو میرے صاف ظاہر ہے کہ خُدا نے مہربان نے انسان کے لئے جن جن قدر انصاف کی انجام دہی کا لائحہ عمل بنا رکھا ہے، ان میں کوئی چیز کسی طرح سے بھی غیر ممکن نہیں، پچنانچہ اہل دانش کے نزدیک یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ انسان کے دائرہ اختیار اور احاطہ قدر انصاف میں جو کچھ داخل ہے، وہ نہ تو ناممکن ہے اور نہ ہی مشکل، کیونکہ یہ بات خُدا تعالیٰ کے علم سے ہرگز نہ ہرگز پوشیدہ نہیں کہ انسان بہت ہی کمزور و ناتوان ہے، اور خُدا نے خود ہی بر بنائے مصلحت و حکمت انسان کو ضعیف (کمزور) بنایا ہے، جیسا کہ قدر آن (۲۸) میں ہے، اور یہی

وجہ ہے کہ پورے دگارِ عالم نے روتے زمین پر ہمیشہ کے لئے اپنے مقدس نور کا وسیلہ مقرر فرمایا ہے، تاکہ ہر شخص نورِ الہی کی طرف رجوع کر کے اپنی کمزوری کا مداوا کرے۔

اب رہا سوال یہ کہ آیا علم و حکمت یعنی آیاتِ قدرت کے تین سمندر قطعاً الگ الگ ہیں، جیسا کہ یہ بظاہر جدا جدا ہیں، یا ان کا کوئی مرکز اور سنگم بھی ہے؟ اس کا جواب یوں دیا جائے گا کہ یقیناً ان کا مرکز اور سنگم ہے، اور وہ انسان کی پاکیزہ رُوح میں پوشیدہ ہے، اور حقیقت میں یہ سنگم وہی ہے، جہاں پر حضرت موسیٰؑ نے سفرِ روحانیت میں نصفِ زمانِ عرصے ملاقات کی تھی، جو تشریح و تاویل اور ظاہر و باطن کے اعتبار سے مَجْمَعُ الْبَحْرَيْنِ (۱/۲۶) دونوں ریاضوں کا سنگم، کہلاتا ہے، جو علمِ لدنی کا مقام ہے۔

اس حقیقت کے ثبوت میں کہ انسان کی ذات میں مذکورہ سمندروں کا سنگم پوشیدہ ہے زیادہ کچھ کہنے کی بجائے صرف مولانا علیؒ کے ایک ارشاد کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے: ”کیا تو گمان کرتا ہے کہ تو ایک چھوٹا سا جسم ہے؛ حالانکہ تجھ میں عالمِ اکبر (بعہ اپنی تمام چیزوں کے) سما گیا ہے۔“ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ انسان کی رُوح اور روحانیت میں ساری کائنات کی حقیقتیں جمع کی گئی ہیں، اور یہ رُوح اپنے درجہ کمال پر کتابِ مُبین (بولنے والی کتاب) ہے۔

بلاشبہ ہر شخص خواہ مومن ہو یا کافر بخدِّ قوت کتابِ مُبین ضرور

ہے، مگر اللہ تعالیٰ کے حضور سے جو نور اور کتابِ مبین (قرآن) آئی ہے (۱۵) اس میں ہر آدمی کا فنا ہو جانا شرطِ لازمی ہے، تاکہ ایسا خوش نصیب شخص حد قوت سے حد فعل میں آ کر کتابِ ناطق بن سکے، یاد رہے کہ فن کی کئی قسمیں ہیں، اور مومن کو جس فنا کی ضرورت ہے وہ مکمل فرمانبرداری کی صورت میں ہے، یعنی ایسی فرمانبرداری جو عقیدت، محبت اور علم کی روشنی میں بجالاتی جاتی ہے۔

اس بیان سے آپ کو بخوبی اندازہ ہوا ہوگا کہ رُوح کے موضوع پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے، کیونکہ رُوح میں جملہ حقیقتوں اور معرفتوں کے اصول خزانے رکھے ہوتے ہیں، ان خزانوں میں خدا کی خدائی اور بادشاہی کے عظیم بھید پوشیدہ ہیں، اور ان میں یہ اسرار بھی ہیں کہ انسان کا خدا سے حقیقی رشتہ کیا ہے، بندوں پر رحمان کی جیسی نوازشات ہیں، ان کی آخری حد کیا ہے، معرفت رُوح کی ہے یا رب کی، یاد دونوں کی، اور کس طرح، وغیرہ، پس رُوح کا موضوع سب سے اہم بھی ہے اور انتہائی پیارا بھی۔

رُوح کی ذات و اصل پر نظر ڈالی جاتے تو معلوم ہوگا کہ وہ آغاز میں بھی اور انجام میں بھی ایک ہی ہے، بلکہ یوں کہنا چاہتے کہ اجسام، ارواح اور عقول جزوی کی مجرد حقیقتیں سرچشمہ عقل میں ایک ہیں کیونکہ کائنات و موجودات کی جملہ اشیاء ایک ہی لوہے کے ٹکڑے (پیشہ موتی) سے پیدا کی گئی ہیں، یعنی گوہر عقل سے، جیسا کہ حکیم پیرنا صخرہ و قس

فرماتے ہیں :-

چہ گوئی از چہ او عالم پدید آورد؟ از کونو
کہ نہ مادت بد و صورت، نہ بالا بود و نہ مہینا

LS

ترجمہ: تیرا کیا خیال ہے؟ خدا نے اس کائنات کو کس چیز سے پیدا کیا؟ گوہر (عقل) سے، کہ وہ نہ تو مادہ و صورت تھا، اور نہ ہی ابعادِ ثلاثہ (طول، عرض، عمق)۔

اس سے ظاہر ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس عالم اور اس کی ہر چیز کو گوہرِ عقل سے پیدا کیا، اور وہ گوہرِ زمان و مکان سے ماورا، ہمیشہ اسی تخلیقی صلاحیت کے ساتھ موجود ہے، کیونکہ یہ قلمِ قدرت یا عامۃً تخلیق کا بلند ترین درجہ رکھتا ہے، لہذا مالکِ قلم (یعنی خدا) اس سے ہمیشہ خلقت کو رقم کرتا رہتا ہے۔

قرآن حکیم کے ایک پر حکمت ارشاد (۹۴) کا مفہوم یہ ہے:
جب کوئی بندہ معبودِ برحق کی طرف رجوع کر جاتا ہے، تو وہ قانونِ وحدانیت کے مطابق نہ صرف تنہا جاتا ہے، بلکہ اپنے جسم، روح

اور عقلِ جزوی کی ہر چیز کو بھی سمجھے چھوڑ کر جاتا ہے، اور شروع میں جیسا تھا ویسا منفرد و مجرد ہو کر جاتا ہے، اس میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ وہ گوہر میں فنا ہو جاتا ہے، یعنی وہ اپنے آپ کو پہلے ہی سے وہاں موجود پاتا ہے، اس مقام کا ایک اور نام عَلَّیِّین ہے، جہاں حقیقی مومنین کی اناتے علویٰ ایک زندہ کتاب یعنی نامۃ اعمال کی صورت میں پہلے ہی سے موجود ہوتی ہے (۱۸/۸۳)

نیز ارشاد فرمایا گیا ہے: اور قیامت کے دن ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور سارے آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپیٹے ہوتے ہوں گے (۳۹/۶۴)، اس ربانی تعلیم سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ جملہ کائنات یعنی تمام چیزیں ایک ہی گوہر سے پیدا کی گئی ہیں اور آخر کار ہر چیز اسی گوہر میں فنا ہو جانے والی ہے، جیسا کہ فنا ہو جانے کا سہی ہے، یاد رہے کہ کائنات کی چیزیں درجہ دار ہیں، اور اس حقیقت کی مثال قرآن حکیم میں سیڑھیوں سے دی گئی ہے (۳۱/۳۱)، چنانچہ کوئی مخلوق خدا تعالیٰ کی سیڑھیوں کے بغیر جُور کر کے مرتبہ اعلیٰ میں فنا نہیں ہو سکتی ہے، لہذا وہ سیڑھی سیڑھی پڑھتی ہے اور انسانی صورت اختیار کر کے گوہر عقل میں جیسا کہ ذکر ہوا فنا ہو جاتی ہے۔

ظاہری مخلوقات کے مدارج کی چار سیڑھیاں ہیں: جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان، جو اسی ترتیب سے ایک دوسرے

سے پیوستہ ہیں، یہ قانونِ بحیثیتِ مجموعی بالکل درست ہے، تاہم اس سے چند مثالیں مستثنا بھی ہیں، جیسے جمادات سے نمک وغیرہ اور نباتات سے پھل جیسی چیزوں کا براہِ راست انسان تک پہنچ جانا۔

سوال ۷۱: جب ہم ساگ پات اور پھل کو توڑ لیتے ہیں، اور جب حلال جانور کو ذبح کیا جاتا ہے، تو اس وقت اُن سے رُوحِ نباتی اور رُوحِ حیوانی نکل ہی جاتی ہیں، پھر ہم ان میں سے جو کچھ کھاتے ہیں، اس میں کونسی رُوح ہوتی ہے؟ گوشت کے ایک ٹکڑے میں حیوانی رُوح ہے یا معدنی رُوح؟ سوال اس لئے ہے کہ اس میں اب نہ تو نباتی رُوح کی طرح نشوونما (GROWTH) ہے، اور نہ ہی حیوانی رُوح کی طرح کوئی حِس، سوان چیزوں کے کھانے سے ہمارے اندر کون سی رُوح بنتی ہے؟

سوال ۷۲: رُوح کے مختلف درجات حقیقتاً کس طرح ایک ہیں؟ اس کی بھی کچھ وضاحت فرمائیں۔

مذکورہ دونوں دلچسپ اور مفید سوالوں کو ہمارے بعض خاص احباب نے اپنے ایک گرامی نامہ کے ضمن میں بھیجا ہے، اور اصل میں یہ مضمون جو آپ کے سامنے ہے انہی سوالوں کے متعلق لکھا گیا ہے، اب یہاں خداوندِ قدوس کی توفیق و یاری سے جو اباً عرض کرتا ہوں :-

جواب ۷۱: معدنی و ارتقاہ کے لئے قانونِ فطرت یہ ہے کہ

ہر مخلوق اور ہر چیز اپنے اُوپر کے درجے میں پہنچنے کے لئے فنا ہو جاتی ہے، چنانچہ نبات اور حیوان بلکہ خدا قسربان اور فنا ہو جاتے ہیں، تاکہ ان کی مُردہ حیثیت یعنی مواد سے ایک نئی عُمَدہ زندگی بنائی جاتے، جب حلال جانور کو ذبح کیا جاتا ہے تو یہ اس کی پہلی فنا ہے، اور جب گوشت پکایا جاتا ہے تو یہ اس کی دوسری فنا ہوگئی، اب قُدْرَتِ خُدا کو دیکھئے کہ یہی چیز جو فنا در فنا ہو چکی ہے، جب اُس کا رِخاۃ حیات میں داخل ہو جاتے گی، جو انسان کے باطن میں پوشیدہ ہے، تو اِس میں سے اَوّل رُوحِ نباتی پیدا ہوگی، پھر رُوحِ حیوانی، اور پہلے سے بہت ہی عُمَدہ حالت میں ہوگی، اُس کے بعد رفتہ رفتہ نباتی رُوح حیوانی رُوح میں اور حیوانی رُوح انسانی رُوح میں فنا ہوتی رہے گی۔

پکا ہوا گوشت کے ٹکڑے میں نہ تو حیوانی رُوح ہے اور نہ ہی نباتی رُوح، بلکہ وہ جمادات کی طرح ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اِس کی مثال میں دانشمندوں پر یہ حقیقت ظاہر کر دینا چاہتا ہے کہ وہ اپنی قدرتِ کاملہ سے کس طرح سے مُردوں کو زندہ کر سکتا ہے، چنانچہ جب گوشت کا یہ مادہ کارِخاۃ بلکہ اور کارِخاۃ دل میں اُتر جاتا ہے، تو اِس میں سے رُوحِ نباتی اور رُوحِ حیوانی دوبارہ زندہ ہو جاتی ہیں، یہ واقعہ ایسا ہے جیسے انسان کا مکرہ دوبارہ زندہ ہو جانا۔

جواب ۷: ازل اور ابد میں جملہ ارواح ایک جیسی ہیں، جس کی مثال مادی کائنات میں سورج سے مل سکتی ہے کہ اِس کے

تمام ذرات میں انفرادیت، مساوات یکنوگی اور وحدت ہے، اور عالم دین میں اس کا نمونہ انبیاء علیہم السلام ہیں کہ وہ حضرت نفسِ واسعہ کی طرح ایک ہیں، یہ سوچنے کا مقام ہے کہ قَانُونَ تَفْضِيلِ لَعِ كَيْ بَاوْجُوْدِ سَبِّ اَنْبِيَاءٍ كَيْنُوْنُوْ كَيْ اِيْكَ هُوْ سَكْتِي هِي، اور اگر عالم صرف دو ہی ہیں: ایک عالم کثرت اور دوسرا عالم وحدت، تو پھر حقیقت سمجھ میں آگئی کہ ایک کے دوسرے پر فضیلت اپنی جگہ پر درست ہے اور باہمی مساوات اور وحدت اپنے مقام پر صحیح ہے، چنانچہ اس دلیل سے ارواح کی مساوات اور ایک ہو جانے کی حقیقت روشن ہو گئی۔

تعصب چھوٹے سے چھوٹا بھی ہوتا ہے اور بڑے سے بڑا بھی، اور اگر کوئی شخص سب سے بڑے تعصب سے خود کو محفوظ رکھنا چاہتا ہے تو اسے اس آیت کریمہ میں غور کرنا چاہیے: اَفْجَبْتُمْ اَلْمَا خَلَقْتُمْ عَبَدًا وَّ اَنْتُمْ اَلْدِيْنَ اَلْتَرَجِعُوْنَ (۲۳/۱۱۵) تو کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو (دیوں ہی) بیکار پیدا کیا اور یہ کہ تم ہمارے حضور میں لوٹا کر نہ لاتے جاؤ گے۔ اس میں بہشت اور دوزخ کے بعد کی حکمت بیان کی گئی ہے، کیونکہ اگر اہل جہنم کا معاملہ

لہ اشارہ ہے اس آیت کریمہ کی طرف: تِلْكَ اَلرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ (۲۵۳) یہ سب رسول (جو) ہم نے (بھیجے) ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔

وہیں پختہ ہو جاتا تو اُس صورت میں اُن کی تخلیق عدت (بیکار) ہو جاتی اور
خدا کے حضور میں سب کے جانے کا ذکر ہی نہ ہوتا، اس سے ظاہر ہے
کہ دوزخ کی سزا کے بعد بھی خدا کی طرف رجوع کرنا ہے۔

کوئی ہوشمند جو قرآن میں غور کرتا ہے اس حقیقت سے انکار
نہیں کر سکے گا کہ خیر بہشت کے آسمان میں سے ہے اور شر دوزخ کے
ناموں میں سے (۳۲/۲۶) چنانچہ ارشاد فرمایا گیا ہے :-

كُلُّ نَفْسٍ ذَا لِقَاءِ الْمَوْتِ ط وَنَبَلُّوْكُمْ بِالشَّرِّ و
وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ط وَالْيَنَّا تَرُجَعُوْنَ (۳۵/۲۱) ہر نفس

(جان) موت کا مزہ چکھنے والا ہے اور ہم تمہیں شر اور خیر میں امتحان
کی غرض سے آزماتے ہیں اور (آخر کار) ہماری ہی طرف لوٹاتے جاؤ
گے۔ دُنیا میں جزوی طور پر خیر و شر ہے اور آخرت میں کلی طور پر
چونکہ خیر و شر بہشت اور دوزخ ہیں اور ان کی وجہ سے لوگوں کی
عملی آزمائش یہ ہے کہ جنت میں علم و حکمت سے لوگوں کی پاکیزگی
ہوتی ہے اور دوزخ میں لوگ جل جل کر بہشت کے قابل ہو جاتے
ہیں، تاکہ وہ وہاں پاک و پاکیزہ ہو کر خداوندِ عالم کے حضور
مقدس جانے کے لائق ہو سکیں۔

یاد رہے کہ بہشت میں دو قسم کے لوگ ہوں گے: تمام انبیاء
کی امتوں میں سے مومنین اور مومنات، اور سحر و غلمان، یہ سحر و
غلمان کون سے لوگ ہیں؟ روحانی سلطنت کی کینزیں اور غلام، جو

دوزخ (یعنی آتش جہالت) کی سزا کے بعد ہمیشہ میں منتقل کئے گئے ہیں تاکہ وہ یہاں علم و حکمت کے ذریعہ جہالت و نادانی سے پاک و پاکیزہ ہو جائیں، جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے :-

وَازْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ (۳۵) اور

(بہشت میں پرہیزگاروں کے لئے) پاک کی ہوتی بیبیاں ہیں اور (سب سے بڑھ کر تو) خدا کی خوشنودی ہے۔ آپ ذرا سا غور کریں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ مَطَهَّرَةٌ ایک ایسا لفظ ہے جو مفعول ہونے کی وجہ سے اس پر تطہیر کا فعل واقع ہوا ہے، مراد یہ کہ جنت کی بیبیاں پہلے پہل تو پاک نہیں تھیں، لیکن بعد میں وہ پاک کی گئی ہیں اور خدا کے نزدیک پاکیزگی تین قسم کی ہوتی ہے، سب سے نچلے درجے پر جسمانی، درمیان میں روحانی اور اعلیٰ درجے پر عقلی و علمی، سو اس سے یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ سحر و غلمان ایک ہی قانون کے تحت ہیں، اور وہ یہ کہ انہیں اول تو جسم کثیف سے جسم لطیف میں لایا گیا ہے، جس میں نہ تو خون ہے اور نہ کسی قسم کی رطوبت و آتش، اور ان کی روح کو خدا کے بزرگ نام سے واقف و آگاہ کیا ہے اور ان کی عقل کو علم و حکمت سے مانوس کر دیا ہے، اور تین قسم کی پاکیزگی انہی تین چیزوں میں ہے موجودہ جسم سے نورانی جسم میں منتقل کر دینا، عبادت کے لئے اسم بزرگ کا عطیہ اور خصوصی علم و حکمت، یہ جسمانی، روحانی اور عقلی پاکیزگی ہے۔

شروع سے لے کر یہاں تک جو کچھ حقائق و معارف بیان ہوئے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ رُوح یقیناً ایک انتہائی پیاری حقیقت ہے، یہ کسی شسک کے بغیر آیاتِ قدرت کا سنگم ہے، اس کے اندر جا کر دیکھنے کے لئے چشمِ بصیرت کی انتہائی ضرورت ہے، اجسام، ارواح اور عقول مجزوی کی مجرّد حقیقتیں سرچشمہٴ عقل میں ایک ہیں، خدا نے کائنات کو گوہرِ عقل سے بنایا، یعنی گوہرِ عقل میں جس طرح اشیاء کی علمی صورتیں تھیں، ان کو روحانیت اور مادیت کا ایک ایک لباس پہنا دیا، دوزخ بھی اور بہشت بھی منزلِ مقصود کے راستے میں حاصل ہیں، انسان کی سب سے آخری منزل گوہرِ عقل اور کلمہٴ باری یعنی مقامِ ”کن“ ہے، اور خدا کی خوشنودی اسی مقامِ اعلیٰ پر ہے۔

خانہٴ حکمت - کراچی

۳۰ اکتوبر ۱۹۸۲ء

”روح۔ ایک انتہائی پیاری حقیقت“ کے مضمون سے متعلق سوالات

۱۔ سوال: اسلام میں چشم بصیرت (دل کی آنکھ) کا ہونا کیوں ضروری ہے؟ کیا تقلید سے کام نہیں لیا جاسکتا؟ بصیرت کی اہمیت کے بارے میں کوئی مثال دیں۔

۲۔ سوال: آیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آیت مبارکہ: قُلْ هٰذٰہٗ... (۱۰۸) میں جس بصیرت کا ذکر ہوا ہے، اس سے نبوت و امامت کا نور مراد ہے؟ اگر یہ حقیقت ہے تو اس کی کوئی دلیل پیش کرو۔

۳۔ سوال: قرآن کہتا ہے کہ: جو شخص اس دُنیا میں چشم بصیرت حاصل نہ کر سکے تو وہ قیامت میں بھی اندھا ہی رہے گا اور یہ دُور کی گمراہی کی وجہ سے ایسا ہوگا (۱/۲۶) آپ بتائیں کہ اس میں مرکزی اشارہ کس چیز کی طرف ہے اور گمراہی کا سبب کیا ہے؟

۴۔ سوال: قرآن کی دوسب سے روشن آیتیں: **اللَّهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ** (۳۵) اور **وَكَذَٰلِكَ أَعْيَاغَا سِرَاجًا مُّنِيرًا** (۳۶) ہیں، کائنات کی دوسب سے تابان آیتیں **سُورَج** اور **جَانِد**، اور عالمِ شخصی کی دو ایسی آیتیں **عَقْل** اور **رُوح** ہیں، تو کیا یہ بھی درست ہے کہ عالمِ دین کی دوسب سے عظیم آیتیں **رَسُول** اور **امام** ہیں؟

۵۔ یہ ارشاد کس کا ہے: **مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ** اور اس کے معنی و مقصد کیا ہے؟

۶۔ کتابِ سماوی کی آیاتِ خاموش و ساکن ہیں، کائنات کی آیاتِ خاموش ہیں مگر ساکن نہیں، یعنی حرکت میں ہیں، اب آپ ہی بتائیں کہ اس کے بعد آیات کی کونسی قسم باقی رہ گئی یعنی انسانی رُوح میں جو آیات ہیں وہ کس نوعیت کی ہو سکتی ہیں؟ کیا اس میں زندہ اور گونیدہ آیات ہیں؟ زندہ اور گونیدہ (بولنے والی) آیات، یعنی معجزاتِ ناطقہ، جو قرآن کی زبان میں آیاتِ بینات ہیں (۲۹/۳۹)

۷۔ انسان کو کمزور کیوں بنایا گیا؟ اس میں کیا مصلحت و حکمت ہے؟

۸۔ دو دریاؤں کے سنگم سے کیا مراد ہے؟ حضرت موسیٰ کا سفر جو مجمعِ البحرین کی طرف تھا، وہ روحانی سفر تھا یا جسمانی؟ غنیمتِ زمان سے کونسی شخصیت مراد ہے؟

۹۔ حدِّ قوت اور حدِّ فعل کی الگ الگ تعریف کر دو اور یہ بتاؤ کہ کوئی کافر کس طرح بحدِّ قوت کتابِ مبین ہو سکتا ہے؟ اس کی مثال کسی ایسے صحابی سے دو، جو پہلے غیر مسلم ہو، پھر اس نے اسلام اور ایمان میں درجہ کمال حاصل کر لیا ہو۔

۱۰۔ سوال: کوئی مومن نورِ ہدایت اور قرآن میں کس طرح

فنا ہو سکتا ہے؟ اس فنا کا طریق کار کیا ہے؟

۱۱۔ سوال: رُوح کی مثال اس ظاہری دُنیا کی کسی چیز سے دے

کہ سمجھائیں کہ رُوح ایک بھی ہے اور لا تعداد بھی، کیا آپ پانی سے رُوح کی بعض حقیقتیں سمجھا سکتے ہیں؟ یعنی دُنیا بھر کے پانی سے۔

۱۲۔ سوال: دراصل معرفتِ رُوح کی ہے یا پروردگاری؟

یادوں کی؟ آیا رُوح (جبکہ اس سے رُوحِ اعظم مراد ہے)، اور رب میں کوئی خاص رشتہ ہے یا کوئی وحدت ہے؟

۱۳۔ سارے بنی آدم خواہ مومن ہوں یا کافر بابا آدم کی

ہستی میں ایک تھے، اب اس حقیقت کا رخ اس طرح ہے کہ پھر آخر میں جا کر تمام بنی نوع انسان آدم جیسی ایک عظیم ہستی میں جمع ہو جائیں گے، تو کیا یہ وحدتِ ارواح کی ایک واضح مثال ہے؟

۱۴۔ اگر سلیم کر لیا جاتے کہ گوہرِ عقلِ قلمِ الہی ہے جو ملک بھی

اور ملکوت بھی کہ وہ عقلی دُنیا ہے اور عقلی صورت میں اس میں ہر ہر چیز موجود ہے، اور وہاں آپ اور ہم یعنی ہر شخص ازلی وابدی طور

پر موجود ہے، تو پھر یہ آنے اور جاتے کا بچھو کر کیا ہے؟

۱۵۔ کیا یہ درست ہے یا نہیں کہ خدا کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ ایک نہیں بلکہ دو پر مبنی ہے؟ چنانچہ ہر انسان کی دو انا میں ہیں ایک انا تے علوی جو ہمیشہ سے ہے اور دوسری انا تے سفلی جو کبھی ہے اور کبھی نہیں؟

۱۶۔ جسم، رُوح اور عقل بجز وی یہ چیزیں خدا کے حضور تک پہنچ نہیں سکتی ہیں، مگر عین الیقین کا آخری مرتبہ وہاں تک رسا ہو سکتا ہے، کیا یہ صحیح ہے؟ یا آپ کو کچھ کہنا ہے؟

۱۷۔ قیامت کے دن کائنات خدا کی مٹھی میں ہوگی، آیا یہ بات تصور جسمانی ہے یا تصور روحانی یا تصور علمی و عقلی ہے؟ کیونکہ بہت سے لوگوں پر زندگی میں یا مگر قیامت گزر چکی ہے، مگر اس کائنات کو مادی طور اب تک کچھ نہیں ہوا، یہ ایسی ہی قائم ہے جیسی شروع میں تھی۔

۱۸۔ مدارج مخلوق کی چار سیڑھیاں کون کون سی ہیں؟ کیا ان میں سے ہر سیڑھی کے بہت سے زینے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو مثال دے کر سمجھا دیں۔

۱۹۔ سوال: حلال جانور کی رُوح بوقت ذبح نکل کر کہاں جاتی ہے؟ کیا یہ درست ہے کہ یہی رُوح جو بہت سے ذرات پر مشتمل ہے متعلقہ لوگوں سے منسلک ہو جاتی ہے؟ کیونکہ اس کا رُخ عالم

انسان کی طرف ہے، جس طرح رُوحِ نَباتی کا رُخ عالمِ حیوان کی جانب ہے۔

۲۰۔ سوال : جمادات، نباتات اور حیوانات کے لئے جبری فنا مقرر ہے، اور انسان کے لئے کون سی فتنہ ہے؟ جبری ہے یا اختیاری یا دونوں؟ اگرچہ دوسری مخلوق کو جبری فنا میں فائدہ ہی فائدہ ہے، لیکن انسان کو اختیار دیا گیا ہے، لہذا اسے علم و عمل اور حقیقی فسرمانبرداری سے اختیاری فتنہ کی سخت ضرورت ہے۔

۲۱۔ کارخانہ بگرا اور کارگاہِ دل کی یہ اہمیت کیوں ہے؟ انسان میں تیسرا اور چوتھا کارخانہ حیات کہاں کہاں واقع ہیں؟ اور ان چاروں کا ربط و سلسلہ کس طرح ہے؟

۲۲۔ کیا آپ سُورج کی مثال پیش کر کے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ مونوریا لزم (یک حقیقت) کا درجہ یعنی نورِ امامت رُوحوں کا سُورج ہے، جس میں جتنی رُوحیں داخل ہیں، اُن سب کی اپنی اپنی انفرادیت بھی ہے، وہ مُساوی بھی ہیں اور اُن میں بے مثال یک رنگی اور وحدت بھی ہے؟

۲۳۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ اِخْوَةٌ، وَالْاَنْبِيَاءُ كَنْفُسٌ وَاِحْدَاة۔ یہ ایک حدیث شریف ہے، اور اس میں دو قرآنی ٹکڑے ہیں تو بتائیے کہ وہ دو ٹکڑے کون کون سے ہیں؟ اور اصل حدیث کا ٹکڑا کیا ہے؟ اور اس حدیث کے معنی و تشریح کیا ہے؟

۲۴۔ اگر ہمارا تصور یہ ہو کہ آخر کار خدا کی بے پناہ رحمت سے سب لوگ بہشت میں ملنے والے ہیں، ہر چند کہ بعض لوگ بہت پہلے وہاں پہنچ چکے ہوں گے اور کچھ لوگ دیر سے جائیں گے، یا جیسا بھی فرق ہو، وہ ضروری ہے، تو کیا یہ ہماری نظریاتی اور علمی وسیع القیاسی ہو سکتی ہے؟

۲۵۔ سور و غلمان اگر جہنمیوں کے ملازم ہیں، یعنی کینیڑیں اور غلام، تو قانونِ رحمت کا دوسرا مرحلہ تو ہونا چاہیے کہ ان کو آزادی ملے، اور آزادی نہیں مل سکتی جب تک کہ یہ لوگ اُس علم کو حاصل نہ کریں جو اہل ایمان کے پاس ہے، اور اگر مان لیا جاتے کہ سور و غلمان کو اہل ایمان سے علم مل جاتا ہے اور وہ آزاد ہو کر درجات پر فائز بھی ہو جاتے ہیں، تو پھر کیا اس سے مومنین کی رونق میں کمی واقع ہوگی؟

خانہِ حکمت - کراچی

۵۔ نومبر ۱۹۸۲ء

